Advertisement at Urdu Palace

Are you looking for an affordable website to advertise your business?
Urdu Palace offers lowest rates for all advertisers.
For Advertisement of your brand or business on our website call us or contact through

Whatsapp on following numbers:+92-348-8709449,+92-303-5110135

www.urdupalace.com

سچا مکمل ناول

یہ زندگی

خالدہ نسیم

آج بھی موسم گرما کی ویسی ہی ستاروں بھری رات ہے۔ ستمبر کی حبس زدہ رات، اندھیری رات..... اور میں آج سے بیس سال پہلے گزری رات کی طرح آسمان پر اپنی تقدیر کا ستارہ تلاش کر رہی ہوں۔ میرے مقدر کا ستارہ ہر بار ہاتھ میں آ کر کیوں کھو جاتا ہے۔ مانا وہ عورت تو خوب صورت تھی جس کی خاطر میرے خاوند نے مجھے، اپنے چھ بچوں کی ماں کو چھوڑ دیا۔ اور آج..... کیا آج پھر میں نے اپنی کم رنگت کی وجہ سے

www.urdupalace.com

مات کھائی ہے؟ نہیں، اس بار ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ صورت سب کچھ نہیں ہوتی تو پھر کیا میری قسمت ہر بار مجھے دھوکا دیتی ہے۔ نہیں، مجھے اپنی قسمت سے کوئی شکایت نہیں..... مجھے زندگی میں سب کچھ ملا..... جس کی کوئی بھی عورت تمنا کرسکتی ہے۔ تو پھر یہ جدائی..... ایک دوسری عورت کا تصور مجھے کیوں چین نہیں لینے دے رہا۔ اس بار میں نے اپنی خوشی سے اجازت دی ہے۔ آخر ساری قربانیاں وہی کیوں دیتا۔ مجھ پر بھی تو کچھ قرض بنتا تھا ناں..... احسان چکانے کا موقع..... سب تسلیوں کے باوجود دل کے مقام پر جو ایک کسک رہ، رہ کر اٹھتی ہے میں اس کا علاج کیا کروں..... اتنے عرصے کی رفاقت، ایک بھرپور رفاقت کے بعد جدائی برداشت نہیں ہو پائے گی۔ اس نے وعدہ تو کیا ہے کہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ مگر کون جانے آنے والا کل کیا لے کر آئے گا یا کیا لے کر جائے گا۔

بڑا کنبہ جہاں بہت سا پیار اور محبت دیتا ہے وہاں بہت سی محرومیاں بھی زندگی میں بھر دیتا ہے۔ ماں گھر کا انتظام بہوؤں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور باپ ریٹائرڈ ہوجاتا ہے۔ بڑے بیٹوں کو پڑھا لکھا کر چھوٹوں کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر رکھ دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ میری اماں کی شادی چودہ برس میں ہوئی اور میری بڑی بہن کی بھی اسی عمر میں۔ آپا کا پانچواں بچہ اور میں اپنے خاندان کا آٹھواں نمبر، ہم عمر تھے۔ والد ہیڈ ماسٹر تھے بڑی بیٹیوں کی شادی کر کے اور تین بیٹوں کو پڑھا لکھا کر افسر بنا کر ریٹائرڈ ہوگئے۔ چونکہ زمین تھی جا کر گاؤں میں رہنے لگے اور ہم دو چھوٹے بچوں کی ذمے داری بڑے بیٹوں پر آگئی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو کبھی گاؤں اور کبھی لاہور بھائیوں کے گھر..... بڑے تین بھائیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ دونوں بہنیں بھی گھر بار والی تھیں۔ ایک بھائی بی اے کا امتحان دینے والا تھا۔ پھر کافی فرق سے ہم دو چھوٹے بہن اور بھائی تھے۔ کیسی صورت بھی سب سے میل نہ کھاتے تھے..... نہ صورت شکل میں اور نہ ہی ذہانت میں..... اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ یہ لے پالک ہیں تو شک نہ ہوتا۔ مگر باہم پیار اس بات کی نفی کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے اور.. فرق چاہے صرف سال بھر کا ہو بڑے کے سامنے نگاہ اٹھا کر بات نہیں کرتے تھے۔ بڑے بھائی سیکریٹریٹ میں کام کرتے تھے جو لارڈ صاحب کا دفتر کہلاتا تھا اور پنجابی میں لاٹ صاحب بن گیا تھا۔ انگریزوں کا وقت تھا، گرمیوں کے دو ماہ آفس اور عملہ پہاڑوں پر چلا جاتا..... بھائی شملہ گئے تو باقی لوگوں کا بھی پروگرام بن گیا..... ہم اپنے تیسرے نمبر کے بھائی کے ساتھ چوبرجی کوارٹر میں رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں سگی بہنیں تھیں سب سے بڑے بھائی علیحدہ رہتے تھے۔

بھائی جان کا خط آیا تو چھوٹے بھائی نے ہمیں تیار ہونے کو کہا خاص طور پر گرم کپڑے اور بستر لے جانے کا کہا..... میری اماں سارا دن پردیسی بیٹے کے لیے سوجی کے سموسے، گاجر کا حلوا، مکئی کی میٹھی روٹیاں اور نہ جانے کیا، کیا بناتی رہیں۔ گاجر کا موسم بھی نہیں تھا پتا نہیں کہاں سے لے کر آئیں۔ جب اپنی تیاری کا وقت آیا تو ایک جوڑا پہن لیا اور دوسرا گٹھڑی میں باندھ لیا۔ کھانے کی دوسری چیزیں ایک کنستر میں بھر لیں اور چھوٹا سا تالا لگا دیا۔ صبح، صبح لاہور سے ٹرین جاتی تھی اور اب ہم لوگ یعنی بڑی آپا ان کے پانچ بچے، بھابیاں مع دو بچوں کے میں، میرا چھوٹا بھائی جو مجھ سے پانچ سال بڑے تھے مگر چھوٹے ہی کہلاتے تھے۔ اور میری اماں..... اسٹیشن پر جلدی مچاتے ہوئے میرے منجھلے بھائی جو ہمیں سوار کرانے آئے تھے۔ اماں نے چپل پہنی ہوئی تھی جس کے اوپر چلتے میں کسی کا پاؤں آگیا اور وہ کھل گئی۔ اب چلنا دشوار تھا۔ بھائی نے جلدی مچائی ہوئی تھی اماں نے چپل اتاری اور گٹھڑی میں اڑس لی۔ بھائی کی نظر نہیں پڑی اسی طرح گاڑی میں سوار ہوگئیں..... سفر اتنے سارے لوگوں کے ساتھ کیسا گزرا یہ تو یاد نہیں مگر جب کالکا کے اسٹیشن

www.urdupalace.com

پر اترے تو بھائی جان کی نظر اماں کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ وہ ایک بڑے آفیسر ہونے کے ساتھ، ساتھ بڑے بھائی بھی تھے۔ اسٹیشن پر سے ایک آنے کا کارڈ خریدا۔ بسم اللہ لکھ کر بھائی کو جھڑکیوں بھرا خط لکھا۔ ماں کو ننگے پاؤں گاڑی میں بٹھاتے تمہیں شرم نہیں آئی دو روپے کی چپل نہیں خرید سکتے تھے۔ اسی طرح کی اور باتیں لکھ کر خط اُن کے دفتر کے پتے پر ڈال دیا۔ پھر کچھ نہ پوچھیں کتنے کارڈ آئے اور کتنے گئے۔ اماں نے دوسرے دن ملازم لڑکے سے جوتی مرمت کروا کر دوبارہ پہن لی اور اسی پرانی جوتی میں واپس لاہور بھی آئیں..... مگر یہ قصہ ایک خاندانی کہانی بن کر چلتا رہا۔

ڈیڑھ ماہ کی چھٹیاں شملہ میں گزاریں، اتنے سارے لوگ دو کمروں میں کیسے رہے تھے ہمیں تو بس یہ یاد ہے کہ محبت سے ہی رہتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اگلے دو سالوں میں میرے تین بھائی آگے پیچھے وفات پا گئے۔ سب سے پہلے وہ عجلت پسند بھائی دو ماہ کی بیماری میں ایک دو سال کا بچہ اور جوان بیوی چھوڑ کر فوت ہو گئے پھر سب سے بڑے بھائی جن کے تین بچے تھے۔ ہارٹ فیل ہو گیا اُن کا جو سب سے زیادہ ہنسنے ہنسانے والے تھے۔ کچھ عرصے بعد چھوٹے سے بڑے بھائی جو بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے لو لگنے سے بیمار ہوئے اور راہِ عدم کو سدھارے۔ یہ تین جوان بیٹوں کا غم تھا جس نے ہماری ماں اور بڑی بہن کی ہنسی چھین لی۔ میں نے انہیں اپنی پوری زندگی میں کبھی ہنستے تو کجا مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔ ایک گہرا جامد غم انہیں اپنی لپیٹ میں لیے رہتا تھا۔ ہم سب کو صبر کی تلقین کرتی وہ خود غم کی تصویر بن کر رہ گئی تھیں۔ میری پڑھائی بھی اس دور میں نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، کچھ میں خود بھی بے پروا تھی اپنے بھتیجوں سے کھیلتی رہتی یا انہیں کھلاتی رہتی۔ چوبرجی کوارٹرز چھوڑ کر ہم پونچھ روڈ پر دوسرے بھائی کے سرکاری گھر میں آ گئے۔ بہ مشکل میں نے سولہ سال کی عمر میں آٹھویں پاس کی۔ 1947ء کے فسادات شروع ہو گئے۔ لاہور میں بھی روز کوئی نہ کوئی جھگڑا اور فساد ہوتا۔ بڑی بہن اپنے بچوں سمیت انبالہ میں تھیں اور سب کو اُن کی بہت فکر تھی۔ خیر وہ ستمبر کے آخر میں بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئیں۔ آرمی میں ہونے کی وجہ سے انہیں لاہور چھاؤنی میں گھر ملا۔ مگر وہ اسکول سے دور تھا۔ میرے بڑے بھائی نے بہنوئی جنہیں ہم بھائی جی کہتے تھے انہیں مشورہ دیا کہ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے محلوں کے محلے غیر آباد پڑے ہیں، میں آپ کے لیے کوئی اچھا سا گھر دیکھتا ہوں۔ آپ کے نام الاٹ ہو جائے گا اور دو سال میں آپ نے بھی ریٹائر ہو جانا ہے پھر آپ اپنے نام کا کلیم داخل کروا سکیں گے۔ پہلے تو وہ راضی نہ ہوئے مگر پھر اس خیال سے کہ آٹھ بچے ابھی زیرِ تعلیم ہیں انہوں نے ہامی بھر لی۔ اس دوران ان کی پوسٹنگ کوئٹہ ہو گئی تو انہیں جانا پڑا۔ ماموں نے بھانجے، بھانجیوں کی محبت میں کہ وہ اکیلے کیسے رہیں گے اپنا سرکاری گھر چھوڑ دیا اور ساتھ والے گھر میں آ گئے ہم بھی ساتھ تھے۔ یہ تین منزلہ گھر تھا سنسان اور غیر آباد..... درمیان والی منزل اندھیری بھی تھی ہم سب اوپر جانے سے ڈرتے تھے۔ ہمارے ساتھ چھوٹی بھابی جو بڑی بھابی کی بہن تھیں ان کے والد، والدہ سب اکٹھے رہتے تھے۔ ابھی میری بڑی بہن کوئٹہ نہیں گئی تھیں تو میرے لیے ایک رشتہ آ گیا۔ ہمارے پرانے محلے دار تھے۔ کافی پرانی واقفیت تھی اُن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے مجھے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ مگر کافی عرصے تک بات آگے نہ بڑھی۔ اس اثنا میں بڑی آپا کوئٹہ ہو کر واپس آ گئیں تو اماں سے رشتے کے بارے میں پوچھا۔ اماں نے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ خود ان لوگوں سے ملنے چلی گئیں۔ واپس آئیں تو خاموش تھیں، میں اور اماں، آپا کے گھر میں تھے اماں کے پوچھنے پر انہوں نے بچوں کی پرانی کاپی سے پھاڑا ہوا ایک کاغذ کا ٹکڑا آگے کر دیا۔ اس میں شکستہ لکھائی میں لکھا تھا کہ..... آپ جس لڑکی کا رشتہ لینے آئی ہیں اس کی شکل تو آپ نے دیکھ ہی لی۔ اسے گھر کا کام بالکل نہیں

www.urdupalace.com

آتا سارا دن پلنگ توڑتی ہے اور محلے کے ایک لڑکے کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔" یہ خط جب مہمان عورتیں باہر دروازے سے نکلنے لگیں تو ایک چھوٹے بچے نے ان کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اللہ جانتا ہے کس نے لکھا تھا۔ شکل صورت میری جیسی بھی تھی اللہ نے بنائی تھی۔ عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر پڑھ کر دل کو تسلی تھی کہ واجبی صورت والی لڑکیاں بھی ہیروئن ہوسکتی ہیں۔ کام بھی مجھے نہیں آتا تھا سوتی بھی زیادہ تھی یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر لڑکے والی بات بالکل جھوٹ تھی۔ زندگی تب تک ایک ہلکا پھلکا خواب تھی۔ ان باتوں کی کہاں عقل تھی یا خیال تھا۔ میں رونے لگ گئی۔ آپا نے تسلی دی اور کہا کہ دوبارہ سے پڑھائی شروع کرو۔ اور اس طرح میں اپنے سے تین سال چھوٹی بھانجی کے ساتھ نویں جماعت میں داخل ہوگئی۔

اسکول کی زندگی کیا خوب صورت تھی۔ ہر وقت مصروف، میری بھانجی کھیل کی شوقین تھی اور میں تالیاں بجانے کی جو اس کی کامیابی پر بجاتی تھی دو سال بعد وہ بیسٹ ایتھلیٹ بن گئی خوب کپ اور ٹرافیاں جیتیں اور انتہائی شاندار طریقے سے وہ اور میں امتحان میں فیل ہوگئیں۔ آپا نے غصہ کھا کر مجھے S.V کرنے شرقپور ہاسٹل بھجوادیا اور بھانجی کو دوبارہ دسویں کا امتحان دلوایا۔ میں واپس آئی تو کچھ لوگ مجھے دیکھنے آئے۔ اس دوران بہت سے لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے آچکے تھے دو سال کے عرصے میں سارے گھر اور محلہ آباد ہو چکا تھا حتیٰ کہ جو خالی پلاٹ تھے اُن میں بھی لوگوں نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں..... یہ خاندان بھی امرتسر سے لٹ لٹا کر نیا، نیا محلے میں آیا تھا۔ لڑکے کی ماں اور بھابی رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اس بار آپا نے بھابیوں سے ذکر نہ کرنا بہتر سمجھا اور اپنے گھر اُن لوگوں کو بلایا۔ بھائی جان اور آپا میری عمر کے حوالے سے پریشان تھے۔ حالانکہ میں انیس کی ہو کر بیسویں میں لگی تھی مگر اُن کے حساب سے زیادہ کی لگتی تھی۔ رشتہ طے ہوگیا، لڑکے کی پہلی بیوی سے سات سال کی ایک بیٹی تھی اور دورانِ ہجرت بیمار ہو کر بیوی فوت ہوگئی تھی اور اب وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھے۔ لڑکا پڑھا لکھا اور سرکاری نوکر تھا۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ جہیز، بری کی کوئی ضرورت نہیں یہ بھی انہوں نے کہا۔ کیونکہ ہم تو اپنا سب کچھ امرتسر چھوڑ آئے..... صرف عزت اور شرافت بچی ہے۔ غرض انہوں نے اماں، ابا، بھائی اور آپا کو باتوں سے خوش کر دیا اور سچی بات کہوں مجھے بھی وہ لوگ اچھے لگے تھے۔ ہمارا خمیر محبت سے گندھا ہوا تھا اور اس میں نفرت کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی جھوٹ کی آمیزش تھی۔ سادگی سے شادی ہوگئی اور میں رخصت ہو کر دوسری گلی میں آگئی۔ دولھا (اقبال قریشی) کو دیکھ کر میں دل و جان سے اس پر عاشق ہوگئی، میری سانولی رنگت اور چھوٹے قد کے سامنے وہ لمبا اونچا خوبرو سفید رنگ کا مرد تھا۔ سارا خاندان ہی گورا چٹا تھا۔ ولیمے والے دن میرا تعارف دو اور لوگوں سے ہوا۔ ایک سولہ سال کا لڑکا اور چودہ سال کی بیٹی معلوم ہوا کہ اقبال قریشی صاحب کے ایک نہیں تین بچے ہیں اور عمر اٹھائیس سال نہیں چالیس سال ہے۔ اب کیا ہوسکتا تھا۔ وقت لوٹا نہیں کرتا، گھر میں بے بے جی، چھوٹی بے بے جی..... تین بچے اور دو بھتیجے جو پڑھائی کے لیے چچا اور دادی کے ساتھ رہتے تھے یہ گھر ہندوؤں کا گھر تھا۔ آدھے حصے میں جیٹھ جی اور ان کے چار بچے جو کافی بڑے تھے اور آدھے حصے میں ہم تھے۔ اوپر کے ایک کمرے میں دونوں بے بے جی اور دوسری طرف کے کمرے میں دو بھتیجے اور اقبال صاحب کا بیٹا اور جیٹھ صاحب کا بیٹا رہتے تھے۔ بھرا پُرا گھر تھا، اچھی رونق رہتی تھی سوائے اس کہ کبھی کبھار میری ساس میری رنگت دیکھ کر ہوکا بھرا کرتیں اور میرے قریشی نہ ہونے پر ابھی اعتراض تھا کہ اگلی نسل دوغلی کہلائے گی۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ اہلِ قریشی میں سے ہیں تو اس میں آپ کا کیا کمال ہے اور اگر میں راجپوت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور..... ہمیں اپنی ذات پر فخر تھا اور نہ ہی شرمندگی خدا تعالیٰ نے جیسے جہاں پیدا

www.urdupalace.com

کردیا اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔

شروع کے کچھ دن بے بے جی اور بڑی بیٹی نے مل کر کھانا بنایا پھر مجھ سے کہا..... مجھے تو کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ بھابیاں بس سارا دن اوپر کے کام کرواتی تھیں..... لہسن چھیل دو، سبزی بنادو، آٹا نکال لاؤ..... کپڑے پھیلا آؤ، بچے کو گود میں لے لو، چولھے کے نزدیک آنے نہیں دیتی تھیں کچھ میں بھی ازلی سست تھی خیر اب میں پریکٹیٹ ہوگئی تھی۔ ایک دن میں نے اپنی جیٹھانی سے دال پکانے کی ترکیب پوچھی پہلے تو انہوں ٹھٹھا لگایا اور پھر کہا۔

''بی بی سلیقہ سسرال والے نہیں سکھاتے بلکہ میکے سے سیکھ کر آتے ہیں۔ سسرال تو کسوٹی ہوتی ہے سونے، پیتل کو پرکھنے کی۔ اللہ بخشے میری دیورانی دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی ہر کام میں ماہر اور خوب صورت بھی۔ بس اللہ نے زندگی نہیں دی۔'' تقریر کے بعد جیٹھانی نے طریقہ سکھایا میں نے اس کے مطابق پیاز ہنڈیا... میں ڈالی براؤن کی اور نمک مرچ ڈال دی تو سارے گھر میں مرچوں کے جلنے سے بُو پھیل گئی اور جو آنکھوں سے لگیں وہ علیحدہ..... جیٹھانی جھپٹ کر آئیں جلتی لکڑیاں باہر کھینچیں اور ہنڈیا میں پانی ڈالا۔ کیا تھا جو پہلے بتادیتیں کہ پانی پہلے ڈالتے ہیں۔ میرے سامنے ہر وقت پہلی بہو کی تعریفیں ہوتیں، میری ساس جہاں مجھے دیکھتیں حق ہا کا نعرہ لگاتیں کوئی ان سے پوچھے حق کیا ہے؟ مری ہوئی کے گُن گانا یا زندہ کو گُن سکھانا، میں ہر کام سیکھنے کو تیار تھی مگر سکھانے والے ہنسی اڑاتے تھے، وہ تو اچھا ہوا میری اماں نے جب میری طبیعت کا سنا تو وہ میرے پاس آگئیں اور انہوں نے کچن سنبھال لیا۔ اس دوران بے بے جی اور ان کی بہن نے کھانا اوپر بنانا شروع کردیا اور بچوں کو بھی وہیں کھلانا شروع کردیا۔ اگلے تین سالوں میں میرے تین بچے ہوگئے، میں مزید موٹی اور کاہل ہوگی۔ خاوند کی بڑی بیٹی کا رشتہ پھپھو کے گھر تھا اس کی شادی ہوگئی۔

خاوند کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا کبھی ساون میں بارش کی طرح کبھی سردیوں میں گرم نرم دھوپ کے مانند، کبھی بہار کا جھونکا یا بادِ سموم کا تھپیڑا..... موسموں کی طرح اس کا مزاج بدلنا، کبھی گریزاں کبھی مہرباں اس کا بار، بار جتانا کہ اسے بچوں کی نہیں اچھی بیوی کی ضرورت ہے۔ میری سمجھ سے باہر تھا۔ بیوی اچھی ہوگی تو بچے بھی ہوں گے۔ اور اگر بچے ہوں گے تو مصروفیت اور دوسرے جھمیلے بھی ہوں گے۔ بہر حال زندگی گزر رہی تھی پھر انہیں گورنمنٹ کی طرف سے آسان قسطوں پر ثمن آباد میں گھر الاٹ ہوگیا۔ این بلاک میں سرکاری گھر تھے ہم وہاں شفٹ ہوگئے۔ میری اماں میرے ساتھ ہی تھیں۔ ایک دن صبح، صبح اطلاع ملی کہ بڑی والی بیٹی جس کی شادی کو ابھی صرف چار سال ہوئے تھے اور دو بچے تھے وہ فوت ہوگئی۔'' رات میں درد قولنج اٹھا..... اور بس..... بچوں کی دیکھ بھال کے لیے انہیں بہن کی ضرورت ہے اس کے ساتھ ہم سب بھی چلے گئے۔ جوان موت تھی سب ہی دکھی تھے۔ یہ بڑی والی بیٹی بالکل اپنی ماں کی طرح سگھڑ تھی اور میری بھی بہت ہمدرد تھی جب تک گھر میں تھی حتی المقدور میری مدد کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی عید تہوار پر بچوں کے کپڑے سی کر بھجواتی تھی۔ اب بچوں کے مسئلے کی وجہ سے اس کی سسرال والوں نے چھوٹی بہن کو روک لیا اور ایک ماہ کے بعد اتنی بڑی عمر کے بہنوئی کے ساتھ خاموشی سے شادی کردی کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر عمر کے اتنے فرق کے بعد بھی ان کی زندگی ماشاء اللہ بہت اچھی گزری..... میری سسرال میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ مقصد اسکول بھیجنے کا..... گھر میں استانی آتی تھی جو انہیں اردو حساب، قرآن مجید، ناظرہ پڑھا دیتی تھی جہیز میں قرآن مجید اور بہشتی زیور دے دیا اور تھوڑا سا اور سامان بہت بعد میں لڑکیوں نے اسکول جانا شروع کیا۔

ثمن آباد میں رہتے ہمیں کچھ وقت گزرا تھا تو قریشی صاحب کی تبدیلی فیصل آباد میں ہوگئی۔ اِدھر میری

www.urdupalace.com

اس جوان عورت نے شور مچانا شروع کر دیا، ان کی بیوی میں ہوں تم کون ہوتی ہو میرے اور میرے شوہر کے درمیان آنے والی۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی اور اونچا، اونچا رونا شروع کر دیا..... اس کی ماں نے اسے زبردستی پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ باہر سے کنڈی لگا دی۔ اندر سے اس کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ساتھ ہی چیزوں کے پٹخنے کی۔ میں تو ڈر گئی کہ کہیں مجھے اور میرے بچے کو نقصان نہیں پہنچا دے۔ ماں شرمندہ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''دیکھا آپ نے بس یہ ایسی ہی ہے۔ بچپن میں باپ مر گیا تھا بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ دیا۔ اوپر سے پیٹ میں رسولیاں ہو گئیں آپریشن کروانے پڑے جب سے لوگوں نے رشتے سے انکار کرنے شروع کیے کہ یہ ماں نہیں بن سکتی تو اسے ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ بھابیوں اور ان کے بچوں کی دشمن بن گئی۔ بھائیوں نے مجھے اور اسے علیحدہ اس گھر میں ڈال دیا۔ ہم آدھا گھر کرائے پر دیتے ہیں کچھ بیٹے مدد کرتے ہیں، اللہ نے قریشی صاحب کو فرشتہ بنا کر بھیجا انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ قریشی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے پریشان رہتے ہیں وہ انتہا کی گندی عورت ہے۔ جاہل ہے، بچے بھی گندے رکھتی ہے۔ گھر بھی گندا رکھتی ہے۔ اور اسی لیے وہ گھر بھی نہیں جاتے، مجھے تو پتا تھا کہ قریشی صاحب کی پہلی بیوی اور بچے ہیں مگر زینب سے ہم نے چھپایا تھا۔ آپ اس کی حالت دیکھ رہی ہیں یہ اپنے ساتھ کسی کی شراکت برداشت نہیں کرتی۔ میں قریشی صاحب کو سمجھاؤں گی وہ آپ کو اخراجات کی رقم بھیجا کریں گے مگر آپ آئندہ یہاں نہیں آئیں۔'' اب میرے پاس وہاں ٹھہرنے کا کیا جواز تھا۔ میں اپنا خاوند واپس مانگنے گئی تھی مگر رہا سہا بھی گنوا آئی۔ میں نے کبھی کسی سے بحث نہیں کی تھی۔ میری جیٹھانی کو ہمیشہ گلہ رہتا تھا کہ میں ہنس کر بات گنوا دیتی ہوں اور میری ساس کہتی تھیں کہ بے کر توت لوگ ہنستے ہیں۔ کوئی کر توت پلے ہو تو لوگ فخر اور غرور کی وجہ سے سنجیدہ رہتے ہیں۔ میرے پاس فخر کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ ہنسوں کی برادری میں، میں کالی بطخ تھی۔ میں نے کبھی کسی بات کا پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا اور مجھے پتا تھا کہ یہی ایک میری خوبی ہے جس سے یہ سب لوگ خوش ہیں۔ میں خالی ہاتھ، خالی دل وہاں سے واپس آ گئی صرف ایک موہوم سی امید لیے کہ آخر وہ باپ ہیں کچھ تو اولاد کا سوچیں گے..... مگر نہیں.....

جولائی، اگست میں بہت بارشیں ہوئیں، بچے اسکول سے آ کر بارش میں کھیلتے رہے۔ شام میں بڑے، لڑکے کو جو میری دو بیٹیوں سے چھوٹا تھا تیز بخار ہو گیا، رات ہونے تک اسے دورے سے پڑنے لگے ڈاکٹر کو بلایا اس نے کہا کہ اسے فوراً اسپتال لے جائیں لگتا ہے گردن توڑ بخار ہے۔ اس زمانے میں فون تھے نہ ایمبولینس ٹانگا کرایا اور میو اسپتال پہنچ گئی۔ بچوں کو ہمسائی کے پاس چھوڑا۔ ڈاکٹروں نے دیکھ بھال شروع کی مگر ان کی مایوسی دیکھ کر میرا دل بیٹھ رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر وہ کہنے لگا کہ آپ خالہ زیب النسا ہیں، میں آپ کے محلے میں رہتا تھا۔ آپ کسی کو اطلاع دے کر بلانا چاہتی ہیں تو بتائیں میں بلا لاتا ہوں۔ میں نے آپا جی کے گھر کا پتا بتایا ان دنوں وہ خود تو پشاور میں تھیں مگر مجھے امید تھی کہ میری بھانجیوں میں سے کوئی آ جائے گا کیونکہ یہ ڈاکٹر صاحب بھی انہیں جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک گھنٹا لگا آنے اور جانے میں..... میری دو بھانجیاں اور قریشی صاحب کا ایک بھتیجا آ گئے۔ بیٹے کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹروں کی کوئی بھی کوشش اسے نہ بچا سکی۔ خاوند کی بے وفائی کا دکھ اور بیٹے کی موت کا منظر میری روح میں اتر گیا۔ موت کی سفیدی اس کی کھلی آنکھوں سے نکل کر میرے وجود میں گھل گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹروں کی منت کی کہ میرے بیٹے کو مردہ خانے میں نہ لے جائیں وہاں کی سردی وہ کیسے برداشت کرے گا۔ میں اول فول بک رہی تھی ڈاکٹرز نے وارڈ بوائے سے کہہ کر اس کا پلنگ باہر برآمدے

www.urdupalace.com

میں رکھوا دیا۔ صبح ہونے والی تھی اس وقت سواری نہیں مل سکتی تھی میں اور میری بھانجیاں پیدل اسپتال سے گھر آئے، بڑی بیٹی کو بتایا تو اس نے بھائی کی لاش کو اپنے گھر لانے کا کہا۔ درمیان کا وقت کیسے گزرا مجھے اپنی ماں کا دکھ اس وقت یاد آیا جب ان کے بیٹے کو اسپتال سے یکے میں گھر لائے تھے میری ماں ننگے سر، ننگے پیر یکے کے پیچھے دوڑتی آئی تھی اور بار، بار کہتی تھی اس کے منہ سے کپڑا ہٹاؤ اس سے کہو ایک بار مجھے دیکھے، میں اس کی ماں ہوں، یہ ایسے کیوں لیٹا ہے؟ وہ بھائی چھبیس برس کا تھا میری ماں نے کیسے صبر کیا ہوگا۔ میرا بیٹا سات سال کا تھا اور میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ جنازے سے اگلے روز قریشی صاحب تشریف لائے کوئی شرمندگی، کوئی ملال ان کے چہرے سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔ دنیا دکھاوے کو چند آنسو بہائے، سوئم کا کھانا کھایا اور کہنے لگے کہ میں بچوں کو گھر چھوڑنے جاتا ہوں، میں نے خاموشی سے بچوں کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ ٹانگے میں بیٹھ کر گھر آ گئی۔ شام تک ہمسائیاں افسوس کے لیے آتی رہیں، رات کو جب بچے سو گئے تو قریشی صاحب نے فرمایا۔

''تم جو ہنگامہ اس دن مچا کر آئی تھیں اس کا خمیازہ بھگتو..... اب میں تمہیں ہرگز بھی ساتھ نہیں رکھوں گا۔ تم اور تمہارے بچے بھاڑ میں جاؤ۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی انہوں نے میرے بال جن پر مجھے کبھی فخر ہوتا تھا ہاتھ میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''تم نے اپنی شکل دیکھی ہے ڈائنوں جیسے دانت دیکھے ہیں، میں تم سے ہمیشہ سے نفرت کرتا تھا۔ اوپر سے بچوں کی فوج.....'' میں نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی۔ میں نے بچے کو کرب کی حالت میں مرتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کو سفید ہوتے دیکھا تھا۔ بچوں کے بارے میں، میں ایک بھی بات سننے کو تیار نہیں تھی، میں زخمی شیرنی تھی، مرنے مارنے پر تلی ہوئی میں نے اُن کے ہاتھ میں دانت گاڑ دیے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹے میں نے گریبان پکڑ لیا اور کہا تو صرف یہ.....

''تم خدا کا عذاب چکھو گے۔ اولاد جیسی نعمت کو ٹھکرا کر تم خود بے کسی کی موت مرو گے' جاؤ یہاں سے یہ میرا گھر ہے۔ میں ماں ہوں، بچے پال لوں گی۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسے۔

''یہ گھر شہباز کے نام ہے، میرے بڑے بیٹے کے اور تمہیں تو میں اسی وقت طلاق دیتا ہوں، چند دنوں میں پیپر زبھی تمہیں مل جائیں گے۔''

اتنا کہا اور گھر سے نکل گئے۔ گویا کہ میری زندگی سے نکل گئے۔ انیس سال کی عمر میں جو زندگی شروع ہوئی تھی وہ انتیس سال کی عمر میں ختم ہوگئی۔ اس رات تو غصے اور طیش کے عالم میں کچھ اور نہیں سوجھ رہا تھا..... مگر بعد کی راتیں مجھے ایک پل کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ میں بچے کی قبر پر جاتی تو مجھے اپنے بچے کے بجائے اپنی ماں یاد آتی تھی۔ وہ اپنے تینوں بیٹوں کی قبر پر ہاتھ پھیرتی رہتی تھی کسی راہ گیر نے رک کر پوچھا۔

''مائی کیا کھو گیا ہے۔'' تو بولیں میرے لعل کھو گئے ہیں انہیں تلاش کر رہی ہوں، اس نے کہا۔ ''مائی صبر کر، جانے والے واپس نہیں آتے۔'' صبر کرنا کتنا مشکل ہے، یہ کوئی ماں کے دل سے پوچھے۔ اور میرے پاس تو کچھ بھی تھا۔ نہ کچھ آگے نہ کچھ پیچھے ایک ہفتے بعد طلاق کا لفافہ مل گیا، میں نے بغیر پڑھے لوہے کے صندوق میں ڈال دیا۔ پڑھ کر بھی کیا حاصل تھا۔ شرعی حق مہر پر پڑھا نکاح تھا۔ کیا ملتا، بچوں سے وہ لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے۔ بڑا بیٹا شرمندہ سا مجھے تھوڑے سے پیسے دے جاتا تھا جس سے گزارہ ہو رہا تھا۔

ستمبر شروع ہو چکا تھا۔ بچوں کو سلا کر میں برآمدے کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ تنہائی اور عجیب سی خاموشی تھی۔ آسمان پر لاتعداد ستارے تھے۔ میں اپنی تقدیر کا ستارہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اب بھی خوابوں کی دنیا میں میری دنیا تھی۔ میرے دل میں، میرے ذہن میں چند شروع کے دنوں کے سرگوشیاں تھیں، اتنی تلخ حقیقت میرا دل قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں اس زندگی کو خواب سمجھ کر بھلا نہیں سکتی تھی۔ میرے سامنے

www.urdupalace.com

چھ زندہ حقیقتیں موجود تھیں جن کے جینے سے میں ڈرتی تھی اور مرنے کا سوچ کر دہل جاتی تھی۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے..... لوگ ان کو ماں کی طلاق کی کسوٹی پر پرکھیں گے کون ان کو اپنائے گا۔ بیٹے کیسے پڑھ لکھ کر معاشرے میں کوئی مقام حاصل کر پائیں گے۔ سوچوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہونے کو تھا۔ لوگوں کے شور سے میرا ارتکاز ٹوٹا..... ایک پل کو 1947ء کا وقت یاد آیا یونہی شور ہوتا تھا جہاں کئی بلوہ ہوتا تھا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ بجایا... اور کہا "سیلاب آرہا ہے راوی کا پانی کنارے توڑ کر بہہ نکلا ہے، بچاؤ اپنا سامان اور بچے اوپر چھت پر لے جاؤ۔" میں نے جلدی سے بڑوں کو جگایا جلدی، جلدی دو چار پائیاں اوپر چڑھائیں سامان کچھ اوپر لے گئے انگیٹھی اور کچھ کھانے کا سامان بھی پہنچایا فجر کی اذانوں کے ساتھ پانی کا زوردار ریلا آیا۔ صحن کی ایک اینٹ کی دیواریں دھماکے سے گر گئیں، شکر ہے گھر پکا تھا کھڑا رہا۔ بچے اوپر محفوظ رہے۔ اگلے دو دن ہم پانی میں گھرے رہے۔ ہیلی کاپٹر سے ڈبل روٹی اور کھانے پینے کی اشیا آرمی والے گراتے تھے۔ تیسرے دن ایک کشتی میں میری بھانجی کا بیٹا جو آرمی میں تھا وہ ڈھونڈتا آیا اور ہمیں نکالا۔ اس کے بعد وہاں گھر کا نشاں بھی نہ رہا جس کی ملکیت سے قریشی صاحب نے مجھے دھتکارا تھا۔ میں دوبارہ سے اپنے بھائی کے گھر واپس آگئی۔ سب کو قریشی صاحب کے بارے میں علم ہو چکا تھا مگر میں نے طلاق والی بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بھابی نے مہربانی کی، مجھے اور میرے چھ بچوں کو گھر کا اندھیرا سا کمرا دے دیا جو ہندوؤں کے وقت میں باورچی خانہ ہوتا تھا۔ یہ وہی محلہ تھا جہاں میں شادی کے بعد بھی رہی تھی، دو گلیاں چھوڑ کر وہی گھر تھا۔ میرے والے حصے میں بڑے جیٹھ آچکے تھے۔ میرے والد فوت ہو گئے تھے اور زمینوں کا سارا انتظام بڑے بھائی کے ہاتھ میں تھا، وہ مصروفیت سے وقت نہ نکال سکتے تھے، نتیجتاً یہ کہ وہاں سے اناج آنا بند ہو گیا۔ میرے سامنے کچھ نہ تھا۔ بچے کیا کھاتے، کیا پہنتے ہیں، وہ سارا دن کیا کرتے پھرتے مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں ہر وقت سوچوں میں ڈوبی چارپائی پر پڑی رہتی۔ بڑے بہنوئی اپنا راشن لاتے تو آٹا، چینی، دالیں مسالے میرے گھر بھی ڈلوا دیتے۔ سالن میری بھابی دے دیتیں یا بڑی آپا کے گھر سے آجاتا۔ تایا کے گھر بچے جاتے تو وہ کچھ نہ کچھ دے دیتے۔ اسکول کا کوئی جھمیلا ہی نہیں تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے جی رہی تھی۔ سورج کب ڈھلا، دن کب نکلا، کچھ پتا نہیں لگتا تھا۔ پھر نہ جانے سب کو کیا ہوا ہر وقت مجھے مشورہ دینے لگے کہ جاؤ اور بچے باپ کے منہ پہ مار کر آؤ۔ وہ عیش کی زندگی گزار رہا ہے اور اولاد گلیوں میں رُل رہی ہے۔ میری سسرال والے بھی یہی کہنے لگے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سب کو بتاؤں کہ میرے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا تھا مگر انا آڑے آجاتی، کسی کا احساس ہوتا کہ کیا بتاؤں گی، میں طلاقن ہوں؟ بچے وہ بھاڑ میں جھونک گیا ہے، ایک بے حس آدمی کو کوئی کیا سمجھائے گا؟ اور پھر آخر یہ سب بڑے بھائی اسے بلا کر کیوں نہیں سمجھاتے مجھے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

آخر میں، میں نے فیصلہ کیا چلو ان کے مشورے پر عمل کر لوں، بچوں کو لے کر میں اسی پتے پر فیصل آباد پہنچی۔ سوچا تھا کہ گلی کے شروع میں چھوڑ آؤں گی۔ دونوں چھوٹے بچے بڑی دو بہنوں نے اٹھا رکھے تھے۔ درمیان والے حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ ماں ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے۔ بچے دروازے تک پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے کسی نے کھولا میں نے انہیں اندر جاتے دیکھا۔ بڑی بیٹی نے مجھے دیکھا ہاتھ ہلایا اور اندر چلی گئی۔ مانو میرا دل، میری روح ساتھ چلی گئی۔ میں خالی جسم کے ساتھ کھڑی رہ گئی..... میں مڑ نہ سکی کہ شاید بچے ابھی باہر آجائیں الٹے چند قدم لیے۔

"پھپھو چلیں۔" میرا بھتیجا میرے ساتھ گیا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا میرے قدم نہیں اٹھے، پیٹ

www.urdupalace.com

سے گولا اٹھ کر حلق میں اٹک رہا تھا۔ چاروں طرف آنسوؤں کی دھند تھی، بچے کہیں نہیں تھے۔ میرا بھتیجا مجھ سے چار قدم آگے چل رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ رو رہا ہے مگر وہ مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اگر اس نے میری طرف دیکھ لیا تو میں ریت کی دیوار کے مانند ڈھے جاؤں گی اور وہ مجھے سمیٹ نہیں پائے گا۔ زمین میرے پاؤں پکڑ رہی تھی مگر میں انہیں گھسیٹ کر آگے کر رہی تھی، اس گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی بچوں کو شاید وہ کھوکھ جلی اللہ کا انعام سمجھ کر قبول کرلے۔ واپسی میں بس میں بیٹھ کر یہ سوچتی رہی کہ میری زندگی کا کیا مقصد ہے؟ کیا کوئی حادثہ مجھے ختم نہیں کرسکتا، روزانہ اتنی بسیں الٹتی ہیں شاید یہ بھی الٹ جائے، روح میری زخمی ہے وجود بھی موت کی وادیوں میں اتر جائے۔ میرا دماغ چوٹ کھالے، میں زندوں کو بھول سکوں اور مردوں کو یاد نہ کر پاؤں پھر مجھے اپنے بھتیجے کا خیال آیا، میرے بھائی کے گھر کا چراغ ہے۔ ابھی اسے کچھ نہ ہو۔ میرے درد کی سزا اسے کیوں ملے۔ بالآخر میں کرچی، کرچی وجود کے ساتھ گھر پہنچ گئی۔ سب پر یہی ظاہر کیا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں بچوں کو صحیح ٹھکانے پر پہنچا آئی ہوں۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کمرے میں ہر طرف سے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں، میری بے پروائی کو دیکھ کر وہ سب آپس میں اکٹھے ہوگئے تھے اور ایک دوسرے کا دھیان کرنے لگے تھے، کچھ کھانے کو نہ ہوتا تو بڑی والی آٹے میں نمک، مرچ ملا کر روٹی پکا دیتی، بہن بھائیوں کو کھلاتی بلکہ میرے منہ میں بھی نوالے ڈالتی، آج میں اصلی معنوں میں اکیلی تن من سے تنہا تھی۔ میری بھانجی مجھے بلانے آئی کہ آپا ڈھاکے سے واپس آگئی ہیں اور مجھے بلا رہی ہیں، میں گئی تو انہوں نے پہلے تو مجھے ڈانٹا کہ میں نے بچوں کو کیوں چھوڑا..... پھر گلے سے لگا کر خود بھی روئیں اور میرا بھی آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ میں نے جی بھر کر اپنی زندگی پر ماتم کیا۔ اپنے آپ کو لعن طعن کی کہ میں کیسی ماں ہوں اپنے ہاتھوں بچوں کو بن ماں کا کر آئی ہوں۔

جمعے کے روز میں بچوں کو چھوڑ کر آئی تھی اور اتوار کی صبح آٹھ بجے وہ میری چارپائی کے گرد کھڑے تھے۔ دھلے دھلائے چہروں اور صاف ستھرے کپڑوں میں، میں سمجھی میں خواب دیکھ رہی ہوں یا میری روح عالم بالا میں ہے اور نعوذ باللہ میرے بچے روحوں کی صورت میں میرے پاس ہیں مگر نہیں یہ حقیقت تھی، وہ سفاک آدمی آخر رحم دل ثابت ہوا۔ بڑی بیٹی نے میری سوتیلی بیٹی کا نام لیا کہ ابا، باجی کے گھر آپ کو بلا رہے ہیں، میں وہاں کس رشتے سے جاتی، میں نے آپا کو بتایا کہ قریشی صاحب بلا رہے ہیں انہوں نے بیٹی کو کہا کہ جا کر ابا سے کہو وہ مجھ سے آکر ملے اور یہاں میرے سامنے کہے جو کہنا ہے۔ وہ میری آپا کا لحاظ بھی کرتے تھے اور ادب بھی۔ اس لیے تھوڑی دیر بعد آگئے، اصل میں ہمارے سب کے گھر نزدیک، نزدیک تھے اور ہم بہ آسانی ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے کہ آپا کچھ کہتیں وہ شروع ہوگئے۔

''میں زیب النسا کو طلاق دے چکا ہوں، میری دوسری بیوی بچوں کو رکھ نہیں سکتی اگر آئندہ سے بچوں کو اُدھر کسی نے بھیجا تو میں انہیں یتیم خانے چھوڑ آؤں گا۔ نام، پتا تو درکنار ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا یہ ساری عمر ان کی شکل کو ترسے گی۔'' آپا ہکا بکا ان کی بات سن رہی تھیں پھر صرف اتنا کہا۔

''اقبال میں اتنا جانتی ہوں یتیموں کے دن پھر جاتے ہیں، اللہ ان کی کفالت کرتا ہے مگر اللہ ظالموں سے ظلم کا حساب بھی ضرور لیتا ہے، جن بچوں کو آج تم بے سہارا چھوڑ رہے ہو یہی تمہارا جنازہ اٹھائیں گے.....'' اور ایسا ہی ہوا آنے والے وقت نے سارے حساب بے باق کردیے..... باپ کیا لاتعلق ہوا تمام سسرالی رشتے داروں کی نظریں بدل گئیں۔ آپا نے بھائی کو بلایا اور مشورہ کیا کہ اب زیب النسا ہماری ذمے داری ہے، ہم مل جل کر اس کا کچھ سوچتے ہیں، انسان کے سوچنے یا فیصلہ کرنے سے کیا ہوتا ہے، کاتبِ تقدیر نے جو مقدر لکھا اسے کون ٹال سکتا ہے۔ بھائی نے کہا میرا گھر حاضر ہے، بہن نے اور ان

www.urdupalace.com

کی بیٹیوں نے مل کر خرچ اخراجات کا ذمہ لیا۔ بڑی دو بیٹیوں کو میری بھانجی گھر میں پڑھاتی تھی، اگلے دو بچے کار پوریشن کے اسکول میں ڈال دیے...... دو بچے چھوٹے تھے وہ گھر پر تھے، ان دنوں کلیم کا چکر شروع ہوا ...... میرے بھائی تو لاہور کے شہری تھے، جائداد ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی تھی اور ان پر مہاجرین کا حق تھا۔ اس لیے بھائی والا گھر اور تیسری منزل میں رہنے والے لوگوں کے نام ہوگیا۔ درمیان کی منزل میں بھی سیالکوٹ سے آئی ایک فیملی رہتی تھی انہوں نے کرایہ دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس طرح سے وہ اسی گھر میں رہے۔ بھائی جان کا بہت عرصے سے ایک چکر چل رہا تھا پہلے تو سب افواہ سمجھتے رہے مگر پھر انہوں نے مان لیا کہ انہوں نے ایک پڑھی لکھی پروفیسر سے شادی کرلی ہے اور وہ عنقریب دوسرے گھر میں چلے جائیں گے۔ ان کے بیٹے بڑے تھے دو ملک سے باہر تھے اور تیسرا ابھی جانے کا سوچ رہا تھا۔ انہوں نے اپنا گھر وحدت کالونی میں شروع کیا ہوا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ جیسے ہی گھر ختم ہوگا وہ شادی کریں گے اور ماں کو ساتھ اُدھر لے جائیں گے۔ میں معاملات کو اپنی ازلی سستی سے دیکھتی تھی۔ ویسے بھی میرے ہاتھ میں کیا تھا جو میں فیصلہ کرنے کے قابل ہوتی۔ سوچتی تھی کہ آپا جی سے کہہ کر اُن کے اوپر والے کمرے میں شفٹ ہوجاؤں گی اور بس...... چھ بچوں کا ایسے گھر میں رکھنا جہاں کوئی شور برداشت نہ کرتا ہو مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میری آپا جو میری ماں کی طرح تھی رات کو اچھی بھلی سوئیں آدھی رات کو دل کا دورہ پڑا۔ اپنے ڈاکٹر داماد کے ہوتے ہوئے بھی کوئی کچھ نہ کر پایا اور وہ ہم سب کو بے سہارا چھوڑ کر اگلے جہاں رخصت ہوئیں۔ سارے رشتے دار اُمڈ کر ان کے گھر آئے ہوئے تھے، رات کو تدفین کے بعد سب موجود تھے۔ آپا کی تمام بیٹیوں کی شادیاں ہوچکی تھیں، بیٹے اپنے گھروں میں تھے چھوٹے دو بیٹے پہلے ہی بڑے بھائی کے پاس تھے۔ اب میرے.... بہنوئی گھر میں اکیلے

تھے سب نے سوچا کہ درمیان والا بیٹا انہیں اپنے پاس لے جائے گا اور گھر کو کرائے پر اٹھادیں گے۔ میرا کس نے سوچنا تھا۔ اس رات صحیح معنوں میں مجھے پتا چلا کہ پیروں تلے سے زمین کیسے نکلتی ہے اور سر سے آسمان کا ہٹنا کیا ہوتا ہے، ستارے کیسے ڈوبتے ہیں اور سورج اندھیرا کیونکر ہوتا ہے، امیدیں دم کیونکر توڑتیں ہیں، سہارے زمیں بوس کیسے ہوتے ہیں، میں لڑکھڑاتی ہوئی ان کے گھر سے اپنے گھر تک آئی۔ گرتے پڑتے وضو کیا، جائے نماز بچھائی اور پتا نہیں کتنے عرصے کے بعد اللہ کے سامنے سر جھکایا۔ میں سجدے میں گری سوائے رونے کے اور اللہ کو پکارنے کے کچھ بھی نہیں کہہ پارہی تھی۔ میرے چھ بچے میرے گرد بیٹھ گئے۔ یہ ستمبر کی ایک ہولناک رات تھی سیاہ اندھیری...... دور، دور تک کوئی روشنی کی کرن نہیں تھی، کہاں جاؤں، کیا کروں...... میں اپنے اللہ سے رو، رو کر پوچھ رہی تھی۔ اور دل اور دماغ سے سمجھ گئی تھی کہ صرف اللہ ہے جو میری مدد کرسکتا ہے۔ میں اب تک بندوں پر تکیہ کرتی آئی تھی اور میرے سب سہارے مجھے چھوڑتے جارہے تھے...... ماں، باپ، بھائی، بہن، شوہر، اب صرف اللہ کی ذات ہے جس پر مجھے بھروسا ہے۔ میں ساری رات سجدے میں گری رہی۔ گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہی اور نہ جانے کس وقت سوئی۔ اگلی صبح آپا جی کی طرف گئی۔ اکثر مہمان جاچکے تھے۔ میری منجھلی بہن ملتان سے آئی ہوئی تھیں اور آپا کی بیٹیاں موجود تھیں، چھوٹی آپا نے مجھ سے پوچھا کہ اب میں نے کیا سوچا ہے؟ پھر خود ہی کہنے لگیں کہ اُن کی ایک بیٹی جو اسکول میں پڑھاتی ہے اس کے انسپکٹر یس آف اسکولز سے اچھے تعلقات ہیں ان سے کہہ کر تمہیں کسی گاؤں کے اسکول میں نوکری دلواتی ہوں بس مجھے اپنا ٹریننگ والا سرٹیفکیٹ ڈھونڈنا تھا۔ میں نے گھر آکر وہ اپنا واحد صندوق جو سیلاب سے بچا کر لائی تھی کھولا تو اس میں سے آٹھویں کی سند اور وہ سرٹیفکیٹ مل گیا اور ساتھ ہی اس ظالم خاکی لفافے پر بھی نظر پڑی

www.urdupalace.com

جس نے مجھے زمانے کی ٹھوکروں کے سپرد کر دیا تھا۔ آپا خود تو اگلے دن واپس چلی گئیں اور مجھے کہہ گئیں کہ تم بچوں سمیت آ جاؤ۔ اپنے بڑے بیٹے کو چھوڑ گئیں کہ مجھے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے اپنے بچوں کے کپڑے دھوئے بستر میں جو کچھ تھا باندھ لیا۔ بھانجیوں نے کرایہ دیا اور میں لاہور اسٹیشن پر آ گئی۔ بھانجے نے ٹکٹ لا کر دیے میں نے دوپٹے سے باندھ لیے۔ اس نے ہمیں ملتان جانے والی ریل کار میں بیٹھا دیا خود ساتھ نہیں آیا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ اسے سیالکوٹ اپنے چچا سے مل کر نوکری کا پوچھنا ہے بعد میں آ جائے گا۔ چھ گھنٹوں میں ٹرین ملتان پہنچی..... جب پلیٹ فارم سے نکلنے لگے تو ٹی ٹی نے ٹکٹ چیک کیے۔ وہ پلیٹ فارم ٹکٹ تھے۔ بھانجے صاحب نے چار پلیٹ فارم ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھمائے تھے۔ باقی سارے پیسے لے کر دودھیال سیر کرنے چلے گئے تھے۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اب کیا کروں؟ ناچار ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ میری بہن یا بہنوئی میں سے کوئی مجھے لینے ضرور آئے گا۔ ان کا گھر اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل ہی چلے جاتے تھے۔ میرے بہنوئی نے گھر کچھ دیر انتظار کیا پھر یہ سوچ کر کہ شاید گاڑی لیٹ ہو وہ اسٹیشن آ گئے میں نے اسٹیشن ماسٹر سے التجا کی کہ اللہ کا واسطہ ہے میرے بہنوئی کو یہ نہ بتائیں کہ ان کے بیٹے نے پلیٹ فارم ٹکٹ دے کر ہمیں گاڑی میں بٹھا دیا تھا بلکہ یہ کہیں کہ کسی نے میری جیب کاٹ لی ہے اور میرے ٹکٹ اور پیسے نکال لیے ہیں۔ ویسے بھی میرے بہنوئی کافی عرصے سے ملتان میں تھے اور ان کی جان پہچان بھی تھی یوں انہوں نے ہمارا کرایہ بھرا اور ہمیں گھر لے آئے۔ یہاں سے میری زندگی کا ایک اور باب شروع ہوا۔ ہفتہ یا دس دن لگے میری بھانجی کی کوشش سے اور انسپکٹر کی مہربانی سے مجھے ملتان اور وہاڑی کے درمیان چک نمبر 434 کے ایک چھوٹے سے سرکاری اسکول میں نوکری مل گئی۔ انتہائی بددلی سے اور آپا کی زبردستی سے لی ہوئی ٹریننگ آخر میرے کام آئی۔ امید و بیم میں گزرا یہ ہفتہ میرے لیے بہت اہم رہا..... محبت میں ہم دوسروں کی خاطر مر جاتے ہیں اور نفرت ہمیں زندہ درگور کر دیتی ہے۔ ایک خاردار جھاڑی کے مانند یہ میرے اندر پنپ رہی تھی، میں ایک بے وفا شخص کی خاطر ساری دنیا سے منہ موڑ رہی تھی۔ نہیں یہ اس آدمی..... جو بدقسمتی سے میرا شوہر تھا سے نفرت نہیں تھی یہ اپنی ذات کے رد کیے جانے کا غصہ تھا، اللہ اور اس کے رسول کو گواہ ٹھہرا کر اس نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا اور پھر دھتکار دیا۔ میرے اندر کانٹے اگتے تھے اور مجھے اندر ہی اندر لہولہان کرتے تھے..... آہستہ، آہستہ مجھے اپنے گرد کے مہربان چہرے یاد آنے لگے۔ بھائی، بہن، ماں، باپ، سہیلیاں، رشتے دار، میں نے ان آٹھ دنوں میں اپنے اندر سے تمام کانٹے نکال پھینکے..... اپنے باپ کی بات یاد کی۔ محبت کرنے والے دل میں خدا تعالیٰ بستا ہے۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ زندگی شروع کرنے کی دعا کی۔ دعا تو کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جینے کی کوئی امنگ باقی نہیں تھی۔ بے حسی اور بیزاری میرے اندر رچ بس گئی تھی۔ اب بھی میرا دل مرنے کی دعائیں مانگتا تھا۔ جینا مشکل لگتا تھا۔ بچوں کا کیا ہے کوئی بھی پال لے گا۔ میرے پاس رہتے ہوئے بھی انہوں نے زندگی کی آسائشوں کو ترسنا ہے، کچھ نہیں تو یتیم خانے تو ہیں، میں بھی ایک بار سینے پر پتھر رکھ کر یتیم خانے میں چھوڑ آئی تھی۔ مگر ہوا کیا تھا۔ صبح دس، گیارہ بجے کے درمیان میں ان کو داخل کروا کر آئی۔ چار بجے بڑی آپا نے بلوایا۔ دیکھا تو سارے بچے بدحالی کی تصویر بنے ان کے گھر میں بیٹھے تھے۔ یتیم خانے کے مالک نے دوپہر میں سارے بچوں کو بھیک مانگنے کے لیے بھیج دیا۔ بڑی بیٹی نے چھوٹے بہن، بھائیوں کا ہاتھ پکڑا اور خالہ کے گھر پہنچ گئی، یتیم خانہ ہمارے ہی محلے میں تھا۔ اس لیے اسے راستہ آتا تھا۔ بڑی آپا نے مجھے میری بے وقوفی پر خوب ڈانٹا۔

چک نمبر 434 میں یہ اسکول کہنے کو سرکاری

www.urdupalace.com

اسکول تھا۔ بلڈنگ کے نام پر ایک بڑا سا کمرا تھا۔ صحن تھا اور بیری کا گھنا درخت تھا۔ جس کے نیچے بلیک بورڈ رکھ کر دری بچھا کر بچے بیٹھ جاتے تھے۔ اسکول صرف لڑکیوں کا تھا اور بیس کے قریب طالبات تھیں۔ اس علاقے میں زیادہ بارش نہیں ہوتی..... ہاں آندھی ضرور آتی تھی' اس صورت میں ہم کمرے کے اندر چلے جاتے تھے۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان تھا۔ رات کو دو... چارپائیاں ڈالتے اور سو جاتے۔ صحن کے ایک طرف غسل خانہ اور ہاتھ سے چلانے والا پانی کا پمپ تھا۔ وہیں پر چھوٹا سا باورچی خانہ گاؤں کے چوہدری صاحب نے بنوا دیا تھا کہ اتنے بچوں کے ساتھ کوئی استانی پہلی مرتبہ یہاں پر آئی ہے۔ بچیوں کی تعلیم کے حامی تھے اس لیے اسکول کی ضرورتوں کا وہی دھیان رکھتے تھے۔ سلائی کی مشین بھی لے کر دی ہوئی تھیں۔ شکر ہے تمام بچیاں جن میں چھ سے چودہ سال تک کی بچیاں تھیں شوق سے پڑھتی تھیں۔ صبح کے وقت ایک مدبر سی عورت قرآن مجید پڑھانے آجاتی تھیں۔ بڑی لڑکیاں چھوٹی بچیوں کو پڑھانے میں مدد کرتیں' اس طرح سے یہ سرکاری اسکول پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک چل رہا تھا اس کے بعد پڑھنے والی لڑکیاں ملتان یا وہاڑی مڈل اور ہائی اسکول جاتی تھیں۔ میرے ذمے رجسٹروں میں فیس اور حاضری کا اندراج کرنا تھا۔ دوبارہ سے کتابیں کھولیں انگریزی، اردو اور حساب خود پڑھا اور اپنی شاگردوں کو پڑھانا شروع کیا..... اردو میری بھائیوں کی بدولت بہت بہتر تھی۔ حساب ابا جی کا پڑھایا ہوا تھا۔ لکھائی کرتے ہوئے ہاتھوں پر مار کھائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بھی اچھی تھی۔ انگریزی سدا سے کمزور تھی مگر بچوں کو خود پڑھ کر پڑھا لیتی تھی۔ میرے اپنے تین بچے اسکول آتے تھے۔ بڑی گھر دیکھتی تھی... اور چھوٹے دو بہن اور بھائی کو سمجھا لیتی تھی۔ لوگ سادہ اور ملنسار تھے وقت اچھا گزر رہا تھا۔ ایک سال ختم ہوا۔ امتحان ہوئے جن بچیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی تھی ان کے لیے چوہدری صاحب سے چھوٹا سا فنکشن کروایا۔ جس میں اسکول انسپیکٹریس اور ساتھ میں عملے کے لوگ بھی آئے۔ رجسٹر وغیرہ چیک کیے۔ رجسٹر چیک کرتے ہوئے میڈم نے سر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا اور ساتھ والے لڑکے سے کچھ کہا۔ میں نے جو سامنے دیکھا تو شرمندگی سے زمین میں گڑ گئی۔ میری دونوں بڑی بیٹیاں گود میں بہن کو لیے میلے کچیلے حلیے میں دیوار سے لگ کر کھڑی تھیں۔ شکل سے ہی یتیم اور گئی گزری لگ رہی تھیں۔ اسکول کی مصروفیت میں ان کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ تین بچے جو اسکول آتے تھے وہ یونیفارم میں ٹھیک تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ انہیں بھی تیار ہونے کا کہتی ان کے پاس صاف کپڑے ہی نہیں تھے۔ سرکاری تنخواہ آٹھویں پاس استانی کی بھلا کتنی ہوتی ہے، بہ مشکل آٹا چنتا تھا۔ دیسی صابن جس سے کپڑے دھل سکتے تھے اسی سے ہم منہ دھوتے تھے دانت ہمیشہ نمک اور کوئلے سے صاف کرتے' دنداسے تک کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ پاؤں کے جوتے خریدنے مشکل تھے۔ عید تہوار پر جو عیدی میری بھانجیوں اور بہن نے بھیجی تھی وہ چارپائیاں خرید لی تھیں۔ میرے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے مٹی کی ہانڈیوں کے..... لسی پی کر ساتھ میں روکھی روٹی کھا کر جی رہے تھے، کبھی کبھار کھیتوں سے ساگ سبزی آجاتی تھی سبز مرچیں کوٹ کر ہنڈیا بناتی تھی۔ اور مستقبل ہنوز اندھیرے میں تھا۔ مگر میں نے بچوں کی خاطر جینے کی ٹھان لی تھی اور بہت دور..... کیا ہوگا، کچھ نہیں سوچتی تھی۔ آج خیریت سے گزر گیا کافی ہے۔ میڈم کے دل میں نہ جانے کیا آیا انہوں نے اشارے سے بچوں کو بلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ آتیں' میں نے جلدی سے کہا میرے بچے ہیں، بڑی ہیں اس لیے اسکول نہیں آتیں۔ کام چھوڑ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا ذرا اپنے سارے بچوں کو بلائیں..... میں نے چھ بچوں کو لائن حاضر کر دیا۔ وہ جھجکے، جھجکے سے سامنے آکر کھڑے ہو گئے..... میرا شرمندگی سے برا حال تھا۔ میڈم نے ہر بچے کا نام اور عمر پوچھی..... ساتھ میں جو

www.urdupalace.com

لڑکا تھا وہ بچوں کی حالت دیکھ کر دم بخود تھا۔ مجھے لگا وہ ابھی رو دے گا۔ مگر وہ جلدی سے دوسری طرف چلا گیا۔ میڈم نے بچوں کو پیار کیا اور اپنے کام میں لگ گئیں میں نے بچوں کو اشارے سے جانے کا کہا۔ وہ اندر کمرے کی طرف چلے گئے۔ جاتے، جاتے میڈم نے کہا کہ آپ اکیلی کام کرتی ہیں اس لیے ہم نے آپ کی تنخواہ ڈبل کر دی ہے، بس آپ سے درخواست ہے کہ اسکول کو چلتا رکھیں۔ بچوں میں سے ایک کو اسکول کے کاموں کے لیے رکھ لیں۔ کسی بھی حیثیت سے، ہم اس کی تنخواہ بھی بھجوائیں گے۔ کاغذوں میں ہیلپر لکھ دیا ہے۔ اور ایک سلائی سکھانے والی جز وقتی استانی رکھ لیں۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ایک عورت جسے سلائی آتی ہے وہ بچیوں کے لیے پہلے سے آتی ہے اور کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔ ہم مطمئن ہیں، مجھے امید تھی کہ ہمارے اگلے دن مزید بہتر ہو جائیں گے۔

اگلے ہفتے چھٹی کے دن عملے کا وہی لڑکا دوبارہ آیا۔ دونوں لڑکوں سے بات چیت کرتا رہا۔ میں نے باتیں نہیں سنیں، چائے، پانی کا پوچھنے کا ہمیں نہ یارا تھا نہ مطلب..... وہ واپس چلا گیا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ یہ کیوں آیا تھا اور کیا باتیں کر رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پڑھائی کا پوچھتے، پوچھتے کہنے لگے کہ ہم اکیلے کیوں رہتے ہیں اور ہمارا باپ کہاں ہے۔ اور باقی رشتے دار کہاں ہیں۔ پھر تم نے کیا جواب دیا۔ میں نے ذرا غصے سے پوچھا تمہیں پتا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے لیے مر چکا ہے۔ سیلاب والی رات جب وہ ملنے آیا تھا تو اس نے یہی کہا تھا ناں کہ اپنے بچوں سے کہہ دو میں ان کے لیے مر گیا ہوں، چھوٹے کو تو نہیں مگر بڑے چاروں بچوں کو سب یاد تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ میں نے یہی کہا کہ وہ مر گئے ہیں، باقی رشتے دار لاہور اور ملتان میں ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پایا کہ مجھے بچوں پر غصہ نہیں کرنا چاہیے مگر باقی دنوں میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اب غصہ زیادہ کرنے لگی ہوں، مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے شادی کے شروع کے دن یاد آتے تھے۔ وہ پیار بھری سرگوشیاں جنہیں میں بالکل بھلا چکی تھی مجھے بیزار کرتی تھیں۔ دن تو مصروفیت میں گزر جاتا تھا مگر رات تنہا لگتی تھی۔ چاندنی راتیں مجھے بری لگتی تھیں اور اندھیری راتوں سے میں ڈرتی تھی۔ بچیوں کی طرف سے فکر مند ہوتی تھی مگر بے بس تھی۔

ایک مہینے کے بعد بجائے اس کے تنخواہ منی آرڈر سے آتی وہ خود دینے چلا آیا۔ ساتھ میں چھوٹا سا فروٹ کا تھیلا بھی تھا۔ رجسٹر پر سائن لیتے ہوئے کہنے لگا اگر کسی کا خاوند مر جائے تو کیا اس کا نام بھی مٹ جاتا ہے۔ آپ صرف اپنا نام لکھتی ہیں، میں نے جواب نہیں دیا۔ کہنے لگا کہ میرا نام شہزاد ہے تعلیم بی اے، بی ایڈ ہے۔ مگر اسکول میں نہیں پڑھاتا، دفتر میں کام کرتا ہوں اور ساتھ میں ٹیوشنز، میں نے زور سے رجسٹر بند کیا۔ اور کہا بس.....! مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں جاننا..... یہ فروٹ واپس لے جائیں اور میری تنخواہ منی آرڈر کے ذریعے ہی آنے دیں۔ آپ کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر وہ ایک ڈھیٹ نکلا۔ بار بار آتا باہر سے ہی بچوں کو ملتا اور واپس چلا جاتا۔ ہر بات میں چھوٹے بچے اس کا ذکر کرتے۔ مجھے برا لگتا پھر میں نے سوچا کہ دوبارہ سے منع کرتی ہوں، اگلی بار آیا تو میں نے اسے اسکول کے اندر بلا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں بات شروع کرتی وہ بولنے لگا۔

''آپ میری آمد کا غلط مطلب نہ لیں، میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، ان بچوں کے سر پر باپ کی طرح شفقت کا ہاتھ رکھنا چاہتا ہوں، ان کے چہروں سے یتیمی کی چھاپ مٹانا چاہتا ہوں۔'' وہ جلدی میں اور کیا کہنا چاہتا تھا میں سننے کو تیار نہ تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے سارے بچے سب کچھ سن رہے تھے۔ میرا شرمندگی سے پیلا پڑتا چہرہ سب کے سامنے تھا۔ اور وہ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر..... اصل میں یہ میری سوچ تھی وہ ہرگز

www.urdupalace.com

اسکول تھا۔ بلڈنگ کے نام پر ایک بڑا سا کمرا تھا۔ صحن تھا اور بیری کا گھنا درخت تھا۔ جس کے نیچے بلیک بورڈ رکھ کر دری بچھا کر بچے بیٹھ جاتے تھے۔ اسکول صرف لڑکیوں کا تھا اور بیس کے قریب طالبات تھیں۔ اس علاقے میں زیادہ بارش نہیں ہوتی..... ہاں آندھی ضرور آتی تھی' اس صورت میں ہم کمرے کے اندر چلے جاتے تھے۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان تھا۔ رات کو دو... چارپائیاں ڈالتے اور سو جاتے۔ صحن کے ایک طرف غسل خانہ اور ہاتھ سے چلانے والا پانی کا پمپ تھا۔ وہیں پر چھوٹا سا باورچی خانہ گاؤں کے چوہدری صاحب نے بنوادیا تھا کہ اتنے بچوں کے ساتھ کوئی استانی پہلی مرتبہ یہاں پر آئی ہے۔ بچیوں کی تعلیم کے حامی تھے اس لیے اسکول کی ضرورتوں کا وہی دھیان رکھتے تھے۔ سلائی کی مشین بھی لے کر دی ہوئی تھیں۔ شکر ہے تمام بچیاں جن میں چھ سے چودہ سال تک کی بچیاں تھیں شوق سے پڑھتی تھیں۔ صبح کے وقت ایک مدبر سی عورت قرآن مجید پڑھانے آجاتی تھیں۔ بڑی لڑکیاں چھوٹی بچیوں کو پڑھانے میں مدد کرتیں' اس طرح سے یہ سرکاری اسکول پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک چل رہا تھا اس کے بعد پڑھنے والی لڑکیاں ملتان یا وہاڑی مڈل اور ہائی اسکول جاتی تھیں۔ میرے ذمے رجسٹروں میں فیس اور حاضری کا اندراج کرنا تھا۔ دوبارہ سے کتابیں کھولیں انگریزی، اردو اور حساب خود پڑھا اور اپنی شاگردوں کو پڑھانا شروع کیا..... اردو میری بھائیوں کی بدولت بہت بہتر تھی۔ حساب ابا جی کا پڑھایا ہوا تھا۔ لکھائی کرتے ہوئے ہاتھوں پر مار کھائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بھی اچھی تھی۔ انگریزی سدا سے کمزور تھی مگر بچوں کو خود پڑھ کر پڑھا لیتی تھی۔ میرے اپنے تین بچے اسکول آتے تھے۔ بڑی گھر دیکھتی تھی... اور چھوٹے دو بہن اور بھائی کو سمجھا لیتی تھی۔ لوگ سادہ اور ملنسار تھے وقت اچھا گزر رہا تھا۔ ایک سال ختم ہوا۔ امتحان ہوئے جن بچیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی تھی ان کے لیے چوہدری صاحب سے چھوٹا سا فنکشن کروایا۔ جس میں اسکول انسپکٹریس اور ساتھ میں عملے کے لوگ بھی آئے۔ رجسٹر وغیرہ چیک کیے۔ رجسٹر چیک کرتے ہوئے میڈم نے سر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا اور ساتھ والے لڑکے سے کچھ کہا میں نے جو سامنے دیکھا تو شرمندگی سے زمین میں گڑ گئی۔ میری دونوں بڑی بیٹیاں گود میں بہن کو لیے میلے کچیلے حلیے میں دیوار سے لگ کر کھڑی تھیں۔ شکل سے ہی یتیم اور گئی گزری لگ رہی تھیں۔ اسکول کی مصروفیت میں ان کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ تین بچے جو اسکول آتے تھے وہ یونیفارم میں ٹھیک تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ انہیں بھی تیار ہونے کا کہتی ان کے پاس صاف کپڑے ہی نہیں تھے۔ سرکاری تنخواہ آٹھویں پاس استانی کی بھلا کتنی ہوتی ہے، بہ مشکل آٹا چلتا تھا۔ دیسی صابن جس سے کپڑے دھل سکتے تھے اسی سے ہم منہ دھوتے تھے دانت ہمیشہ نمک اور کوئلے سے صاف کرتے' ڈنڈا سے تک کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ پاؤں کے جوتے خریدنے مشکل تھے۔ عید تہوار پر جو عیدی میری بھانجیوں اور بہن نے بھیجی تھی وہ چارپائیاں خرید لی تھیں۔ میرے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے مٹی کی ہانڈیوں کے..... کسی پی کر ساتھ میں روکھی روٹی کھا کر جی رہے تھے، کبھی کبھار کھیتوں سے ساگ سبزی آجاتی تھی سبز مرچیں کوٹ کر ہنڈیا بناتی تھی۔ اور مستقبل ہنوز اندھیرے میں تھا۔ مگر میں نے بچوں کی خاطر جینے کی ٹھان لی تھی اور بہت دور..... کیا ہوگا، کچھ نہیں سوچتی تھی۔ آج خیریت سے گزر گیا کافی ہے۔ میڈم کے دل میں نہ جانے کیا آیا انہوں نے اشارے سے بچوں کو بلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ آتیں' میں نے جلدی سے کہا میرے بچے ہیں، بڑی ہیں اس لیے اسکول نہیں آتیں۔ کام چھوڑ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا ذرا اپنے سارے بچوں کو بلائیں..... میں نے چھ بچوں کو لائن حاضر کر دیا۔ وہ جھجکے، جھجکے سے سامنے آکر کھڑے ہو گئے..... میرا شرمندگی سے برا حال تھا۔ میڈم نے ہر بچے کا نام اور عمر پوچھی..... ساتھ میں جو

www.urdupalace.com

لڑکا تھا وہ بچوں کی حالت دیکھ کر دم بخود تھا۔ مجھے لگا وہ ابھی رو دے گا۔ مگر وہ جلدی سے دوسری طرف چلا گیا۔ میڈم نے بچوں کو پیار کیا اور اپنے کام میں لگ گئیں میں نے بچوں کو اشارے سے جانے کا کہا۔ وہ اندر کمرے کی طرف چلے گئے۔ جاتے، جاتے میڈم نے کہا کہ آپ اکیلی کام کرتی ہیں اس لیے ہم نے آپ کی تنخواہ ڈبل کر دی ہے، بس آپ سے درخواست ہے کہ اسکول کو چلتا رکھیں۔ بچیوں میں سے ایک کو اسکول کے کاموں کے لیے رکھ لیں۔ کسی بھی حیثیت سے، ہم اس کی تنخواہ بھی بھجوائیں گے۔ کاغذوں میں ہیلپر لکھ دیا ہے۔ اور ایک سلائی سکھانے والی جز وقتی استانی رکھ لیں۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ایک عورت جسے سلائی آتی ہے وہ بچیوں کے لیے پہلے سے آتی ہے اور کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔ ہم مطمئن ہیں، مجھے امید تھی کہ ہمارے اگلے دن مزید بہتر ہو جائیں گے۔

اگلے ہفتے چھٹی کے دن عملے کا وہی لڑکا دوبارہ آیا۔ دونوں لڑکوں سے بات چیت کرتا رہا۔ میں نے باتیں نہیں سنیں، چائے، پانی کا پوچھنے کا ہمیں نہ یارا تھا نہ مطلب..... وہ واپس چلا گیا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ یہ کیوں آیا تھا اور کیا باتیں کر رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پڑھائی کا پوچھتے، پوچھتے کہنے لگے کہ ہم اکیلے کیوں رہتے ہیں اور ہمارا باپ کہاں ہے۔ اور باقی رشتے دار کہاں ہیں۔ پھر تم نے کیا جواب دیا۔ میں نے ذرا غصے سے پوچھا تمہیں پتا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے لیے مر چکا ہے۔ سیلاب والی رات جب وہ ملنے آیا تھا تو اس نے یہی کہا تھا ناں کہ اپنے بچوں سے کہہ دو میں ان کے لیے مر گیا ہوں، چھوٹے کو تو نہیں مگر بڑے چاروں بچوں کو سب یاد تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ میں نے یہی کہا کہ وہ مر گئے ہیں، باقی رشتے دار لاہور اور ملتان میں ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پایا کہ مجھے بچوں پر غصہ نہیں کرنا چاہیے مگر باقی دنوں میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اب غصہ زیادہ کرنے لگی ہوں، مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے شادی کے شروع کے دن یاد آتے تھے۔ وہ پیار بھری سرگوشیاں جنہیں میں بالکل بھلا چکی تھی مجھے بیزار کرتی تھیں۔ دن تو مصروفیت میں گزر جاتا تھا مگر رات تنہا لگتی تھی۔ چاندنی راتیں مجھے بری لگتی تھیں اور اندھیری راتوں سے میں ڈرتی تھی۔ بچیوں کی طرف سے فکر مند ہوتی تھی مگر بے بس تھی۔

ایک مہینے کے بعد بجائے اس کے تنخواہ منی آرڈر سے آتی وہ خود دینے چلا آیا۔ ساتھ میں چھوٹا سا فروٹ کا تھیلا بھی تھا۔ رجسٹر پر سائن لیتے ہوئے کہنے لگا اگر کسی کا خاوند مر جائے تو کیا اس کا نام بھی مٹ جاتا ہے۔ آپ صرف اپنا نام لکھتی ہیں، میں نے جواب نہیں دیا۔ کہنے لگا کہ میرا نام شہزاد ہے تعلیم بی اے، بی ایڈ ہے۔ مگر اسکول میں نہیں پڑھاتا، دفتر میں کام کرتا ہوں اور ساتھ میں ٹیوشنز، میں نے زور سے رجسٹر بند کیا۔ اور کہا بس.....! مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں جاننا..... یہ فروٹ واپس لے جائیں اور میری تنخواہ منی آرڈر کے ذریعے ہی آنے دیں۔ آپ کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر وہ ایک ڈھیٹ نکلا۔ بار بار آتا باہر سے ہی بچوں کو ملتا اور واپس چلا جاتا۔ ہر بات میں چھوٹے بچے اس کا ذکر کرتے۔ مجھے برا لگتا پھر میں نے سوچا کہ دوبارہ سے منع کرتی ہوں، اگلی بار آیا تو میں نے اسے اسکول کے اندر بلا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں بات شروع کرتی وہ بولنے لگا۔

''آپ میری آمد کا غلط مطلب نہ لیں، میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، ان بچوں کے سر پر باپ کی طرح شفقت کا ہاتھ رکھنا چاہتا ہوں، ان کے چہروں سے یتیمی کی چھاپ مٹانا چاہتا ہوں۔'' وہ جلدی میں اور کیا کہنا چاہتا تھا میں سننے کو تیار نہ تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے سارے بچے سب کچھ سن رہے تھے۔ میرا شرمندگی سے پیلا پڑتا چہرہ سب کے سامنے تھا۔ اور وہ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر..... اصل میں یہ میری سوچ تھی وہ ہرگز

www.urdupalace.com

بھی حیران نہیں تھے کہ ان کی مسکراہٹ کچھ اور کہہ رہی تھی کیونکہ جاتے، جاتے اس نے انہیں انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر دکھایا تھا۔ اور میں سمجھ گئی کہ وہ انہیں شیشے میں اتارنے کی کوشش کر چکا ہے۔ یہ کوئی یقین کرنے والی بات تھی۔ ایک نے جیتے جی بچوں کو یتیم کر دیا اور اب دوسرا بچوں کی وجہ سے مجھے اپنانا چاہتا ہے۔ باپ بن کر اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنے کی بات کرتا ہے، بچے اٹھتے بیٹھتے اس کی کوئی نہ کوئی بات کرتے، میں سنی ان سنی کر دیتی۔ اس کی روز، روز کی آمد مجھے پریشان کر رہی تھی اور برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میں نے پھر بات کرنے کا سوچا۔ وہ مسکین سی صورت بنا کر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھ سے دس سال چھوٹا..... چھوکرا سا دکھتا مجھ سے یعنی چھ بچوں کی ماں سے شادی کا خواہش مند تھا۔

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گی۔ تم بچوں کو ورغلا کر مجھے بلیک میل کرو گے۔ ایک بار کا تجربہ میرے لیے کافی ہے۔''

میری اس بات پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مجھے بھی ایک دم خیال آیا کہ آج اس کی غلط فہمی دور کر دوں..... ''تمہیں پتا ہے مجھے میرے خاوند نے طلاق دی تھی۔ وہ مرا نہیں زندہ ہے مگر اس نے ہمیں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرو گے؟ بتاؤ کرو گے؟'' میں چلائی تھی۔ وہ اٹھا، مجھے پینے کو پانی لا کر دیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، سکون سے بیٹھیں پھر بات کرتے ہیں، مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا جو ابھی آپ نے کہی ہے۔ آپ سے شادی کا فیصلہ میں نے جذباتی ہو کر جلدی میں نہیں کیا۔ سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس کے لیے میرے پاس ٹھوس وجوہات ہیں جو میں آپ کو بتاؤں گا۔ میں دیکھنے میں چھوٹا لگتا ہوں مگر ایک سمجھدار ہوش مند آدمی ہوں۔''

''اچھے سمجھدار ہو، تمہیں پتا ہے میں ایک جاہل عورت ہوں جس کے پاس کوئی ہنر نہیں، میرے بچے گندے، سندے رہتے ہیں۔'' میں شاید ہسٹیرک ہو رہی تھی، پرانی باتیں جو اتنی دیر سے مجھے اندر سے کاٹتی تھیں میری زبان پر آنے کو بے تاب تھیں۔

''دیکھیں میں موٹی، کالی، کاہل اور سست الوجود عورت ہوں مجھے کوئی پسند نہیں کر سکتا اور نہ ہی مجھے کوئی خوش فہمی ہے۔'' اس پر وہ کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

''مجھے لگتا ہے آپ نے بہت عرصے سے آئینہ نہیں دیکھا۔ آپ یوں کریں مجھے اپنی بڑی بہن کا پتا دیں، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں آپ سے پھر بات ہو گی۔'' اس نے ملتان کا ایڈریس لیا اور چلا گیا۔

اتوار کو صبح ابھی دس بجے تھے میری بہن اور بہنوئی آ گئے میں اُن کے تیور دیکھ کر جان گئی کہ اب میری خیر نہیں..... انہوں نے ڈھنگ سے برقع بھی نہیں اتارا اور شروع ہو گئیں۔

''تم کیا سوچ کر اس عمر میں شادی کرنے چلی ہو۔ کچھ تو تم نے کہا ہو گا جو اس لڑکے کی اتنی ہمت ہوئی کہ وہ تمہارا رشتہ لے کر پہنچ گیا۔ میں تو سمجھی کہ وہ شاہدہ کے لیے آیا ہے اور اس سے کہا کہ وہ تو ابھی تیرہ کی بھی نہیں اس پر بولا کہ میں تو آپ کی بہن زیب النسا کے لیے آیا ہوں..... میرا جی چاہا، میں شرم سے ڈوب جاؤں کہیں منہ چھپالوں، میں نے اس کو اتنی سنائیں کہ اب دوبارہ کبھی ہمت نہیں کرے گا آنے کی۔ لو جی چھ کیا سات بچوں کی ماں شادی رچانے چلی ہے۔'' میں کیا کہتی وہ حق پر تھیں۔ اور میں نہ ہوتے ہوئے بھی غلطی پر تھی۔ ایک نے بچوں کی وجہ سے ٹھکرایا۔ اور دوسرا بچوں کی وجہ سے اپنانے کی بات کرتا ہے۔ میں تو کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں تھی۔ فیصلہ کیا کرنا تھا، آپا ٹھیک کہہ رہی تھیں سب غلط ہو رہا تھا۔ بھائی جان انہیں خاموش کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں چوہدری صاحب کے گھر سے ان کا ملازم آیا اور کہنے لگا۔

''بی بی نے کہا ہے کہ آپ کے بھائی اور بہن آئے ہیں ان سے کہیے وہ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ ظہر کی

www.urdupalace.com

نماز کے بعد آجائیں۔'' ملازم کے سامنے تو وہ چپ رہیں اس کے جاتے ہی شروع ہوگئیں۔

''لو اس کی کسر باقی تھی۔ انہیں بھی سن گن مل گئی ہوگی اور اب مجھے جوتے ماریں گی کہ استانی کو دیکھو عشق اور شادی کرنے چلی ہے اللہ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں۔'' میں اپنی جگہ شرمندہ تھی اور شہزاد پر غصہ آرہا تھا کہ بیٹھے بیٹھائے کس مصیبت میں ڈال گیا۔ لوگ کتنی ہنسی اڑیں گے کیا اب مجھے یہاں سے بدنامی لے کر جانا پڑے گا۔ نئے سرے سے سب کچھ شروع کرنا پڑے گا میرے اللہ تو نے مجھے ہمیشہ مشکلوں کے لیے چن لیا ہے؟

وہ کھانا کھا کر واپس آئے تو دونوں کچھ خاموش سے لگے۔ میں نے کہا ''آپا جی اللہ کا واسطہ مجھے سچ، سچ بتائیں انہوں نے کیا کہا ہے۔''

''شہزاد چوہدری صاحب کے پاس پچھلے دو تین ماہ سے آرہا ہے۔ اور انہیں اس رشتے کے لیے کہہ رہا ہے۔ مگر وہ بھی تم سے بات کرتے جھجک رہے تھے کہ نہ جانے تم کیا سمجھو..... ہمارے آنے کا بھی شہزاد نے ہی انہیں بتایا تھا۔ اور ان کا کہنا ہے کہ وہ اس رشتے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ بچپن سے وہ شہزاد کو جانتے ہیں، ذمے دار لڑکا ہے، رشتے داروں میں صرف اس کی ماں ہے، باپ بچپن میں فوت ہوگیا تھا اور شاید اسی لیے وہ یتیمی کا درد سمجھتا ہے۔ انہوں نے ہمیں کہا ہے کہ ہم دوبارہ اس سے مل لیں۔ وہ اپنے بارے میں ہمیں خود بتانا چاہتا ہے۔ میں نے چوہدری صاحب سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ ذمے داری لیتے ہیں تو دوبارہ ملنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے کہہ دیں وہ ملتان آجائے میرا خیال ہے تم بھی بچوں کے ساتھ آجانا۔'' ان کی پوری بات سن کر میں نے صاف منع کر دیا کہ میں نہیں آؤں گی آپ جائیں اور آپ کا کام بھائی جان نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ میری طرف سے صاف نہ ہے اور اس میں کوئی گنجائش نہیں، میں اپنی دنیا میں مطمئن ہوں مگر چوہدری صاحب اور ان کی بیگم نے شاید کچھ زیادہ مذہبی ڈراوا اور مثالیں گوش گزار کر دی تھیں کہ جاتے، جاتے آپا کہنے لگیں۔

''میں سوچتی ہوں کفران نعمت نہیں کرنا چاہیے۔ تمہاری تنہائی کا سوچ کر میرا دل کڑھتا تھا اور اب اگر بچوں کو سائبان مل رہا ہے تو تم بھی غور کر لو۔ اکیلی تم ان کے اخراجات اور ضرورتیں پوری نہیں کر سکو گی۔ ساری عمر بھی جمع کرتی رہو گی تو صرف پیٹ بھر پاؤ گی ان کی پڑھائیاں، شادی..... میں تو سوچ کر گھبرانے لگتی ہوں۔'' وہ یہ سب کہہ کر خود تو چلی گئیں اور میرے لیے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ گئیں۔ میں نے سارا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا کہ جو اس کے نزدیک میرے لیے بہتر ہو وہ ہو جائے..... چوہدری صاحب کی بیگم ملنے آئیں تو کہنے لگیں۔'' ہمارا خیال ہے اسکول قدرے چھوٹا ہے، ہم سوچ رہے ہیں کہ ایک کمرا اور بنوالیں کچھ مدد سرکاری محکمہ کر دے گا کچھ ہم سب مل کر لیں گے۔ بچیاں سلائی اور خانہ داری بھی کرتی ہیں۔ باورچی خانے کو بھی کام کرنے والا بنا دیتے ہیں۔ جس میں دو چار لڑکیاں ایک ساتھ کھانا بنا سکیں۔ میں ان کا مطلب سمجھ رہی تھی اچھا تھا۔ کسی بہانے اسکول میں ذرا گنجائش نکل آئے گی۔ ایک ماہ میں یہ کام ہوگئے اس دوران ہم اسکول کی جماعتیں مسجد کے صحن میں لگاتے رہے۔ صبح سات بجے سے لے کر ظہر کی نماز تک کافی وقت مل جاتا تھا۔ نئی کلاسز شروع ہو رہی تھیں۔ کام آرام سے کر رہے تھے۔

آپا جی کا خط آیا تھا کہ شہزاد سے ملاقات کافی اچھی رہی، ہم مطمئن ہیں اگلے ہفتے کے دوران ہم کوئی مناسب دن سوچ رہے ہیں، تمہارا نکاح ہو جائے گا۔ اس سے پہلے شہزاد تم سے ملنے آئے گا ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا، مجھے کیا سوچنا تھا۔ انسان کا دل خدا تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ کوئی صرف یہ کہہ دے کہ وہ ہماری پروا کرتا ہے تو اس کا خیال بار، بار آتا ہے۔ دماغ اس کے بارے میں سوچتا ہے، شہزاد کا یہ کہنا کہ میں نے عرصے سے آئینہ نہیں دیکھا بالکل ٹھیک تھا۔ ہمارے گھر میں آئینہ تھا ہی نہیں۔ پانی سے منہ دھو کر پونچھ لینا اور

www.urdupalace.com

بغیر دیکھے کنگھی کرلینا، معمول تھا۔ بچیاں بھی چھوٹی تھیں۔ میں ہی اُن کے بال دھو کر سلجھا دیتی تھی۔ اس کے اس ایک جملے کی بازگشت میرے کانوں میں گونجتی تھی۔ کہتے ہیں محبت ایک بار ہوتی ہے، وہ میں کر چکی تھی انجام بھی بھگت لیا تھا۔ جینے کا ڈھنگ بدل جائے تو محبت کسی نہ کسی رنگ میں ہمارے اندر اتر آتی ہے۔ میں اپنے اور بچوں کے بارے میں خودغرض بن کر سوچ رہی تھی۔ بچوں کو سائبان مل رہا تھا، تو میں کیوں نہ لوں۔ وہ دوسری شادی کر کے گھر بسا سکتا ہے تو میں کیوں نہ کرلوں...... لوگ باتیں بناتے ہیں تو بنائیں میں سن لوں گی۔ لوگوں نے اس کے علیحدہ ہوتے وقت بھی بہت کچھ کہا تھا۔ کچھ نے ہمدردی کی آڑ میں اور باقیوں نے طعنوں کی صورت میں...... میرے اندر ابھی منفی سوچیں تھیں خوشی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا...... ویسے بھی میں تنہائی اور بے رخی کی ڈسی ہوئی زخمی عورت تھی۔ ہمدردی مل رہی تھی نہ کیسے کرتی۔ میں نے شہزاد سے صرف ایک سوال پوچھا تھا کہ وہ چھ بچوں کی ماں سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ اسے ایک اچھی ہم عمر بیوی آسانی سے مل سکتی ہے۔

اس کی ایک اپنی ہی کہانی تھی۔ اس نے کہا جو زندگی ہم شروع کرنے جا رہے ہیں اس میں جھوٹ کی گنجائش نہیں۔ میں آپ سے سچ کہوں گا اس دن اسکول میں آپ کے بچوں کو دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرا سارا بچپن پھر سے آ کھڑا ہوا تھا۔ میں چھ سال کا تھا جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ ہمارا گھر ملتان کی حدود میں ہی ہے۔ مگر ذرا ہٹ کر بیراں غائب میں ہے۔ میرے دادا، دادی، تایا سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے باپ کی موت کے بعد میری دادی غم سے نڈھال رہتی تھی۔ میرے ابا گھر میں سب سے چھوٹے تھے اور ماں، باپ کو بہت عزیز تھے ایک ماہ کے اندر، اندر وہ فوت ہوگئیں۔ پھر میرے ماموں آئے اور زبردستی مجھے اور اماں کو ساتھ لے گئے۔ بہت بعد میں مجھے پتا لگا کہ تائی

آس

تجھ بن زندگی گزر رہی ہے ایسی
اماوس کی راتوں جیسی
بھیگی پلکیں، لرزاں سانسیں، بکھری زلفیں
جانے کب سنوریں گی
بہت سونا، سونا ہے دل کا آنگن
جانے کب خوشبوئیں ادھر کا رستہ دیکھیں گی
جانے کب دل کی کلی مسکرائے گی
جانے کب چاندنی میرے آنگن میں پھر سے آئے گی
جانے کب تک اداسی آنکھ کے بستر میں چھپ کر روئے گی
اور کتنے سپنوں کو یہ بے گھر کرے گی
جانے کب ٹلیں گی شب فراق کی ظلمتیں
جانے کب نئی سحر نوید بہار لائے گی
یہ سال بھی گزر گیا ہے اس کے مَن کی آس میں، ہر سال کے جیسے

عین الحیا ترمذی، وادیِ کاغان

گزارش

مجھ سے غلطی ہائے مضامین مت پوچھ لکھاری بہنوں، بیٹیوں سے گزارش ہے کہ جب بھی اپنا لکھا ہوا سوپ، ڈراما، ٹی وی پراجیکٹ ڈائریکٹر کو دیں تو...... ازراہ کرم کرداروں کا لب و لہجہ...... تلفظ، مکالموں کی صحیح ادائیگی پر ضرور توجہ دیں۔ بڑی کوفت ہوتی ہے جب خودکُش کو خودکَش اور ہندوکُش کو ہندوکَش بولا جاتا ہے۔ یہ شکوہ اینکر پرسن اور خبر پڑھنے والوں سے ہے۔ انداز بیاں ایسا دھواں دھار کہ جوش ملیح آبادی کے بھی ہوش اڑ جاتے۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔

اسی طرح نعت خواں حضرات، خواتین الفاظ کی غلط ادائیگی کرتی ہیں، یہاں تک کہ اُمِ حبیبہ نعت خواں نے بھی جامی کا فارسی کلام غلط ادائیگی سے پڑھا ہے۔ اردو زبان، عربی، فارسی، ترکی کا حسین مرقع ہے اگر ہم قرآن پاک عربی میں ٹھیک طرح سے زیر زبر کو دھیان سے پڑھتے ہیں تو اردو میں یہ غلطیاں کیوں؟ مرحومہ اقبال بانو مغنیہ اساتذہ کا کلام پڑھنے سے پہلے اپنے الفاظ کی ادائیگی درست کرتی تھیں حالانکہ خود اہلِ زبان تھیں۔ باقی عابد کو عابد اور زاہد کو زاہد پڑھنے کہنے والے بہت...... کس، کس کا گلہ کرے کوئی۔

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

www.urdupalace.com

ہمیں ساتھ رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ میری امی کی خوب صورتی سے خوف کھاتی تھیں..... ماموں بہت اچھے تھے مگر ممانی ہر طریقے سے میری ماں کو تنگ کرتی تھیں۔ ہمارا خرچ اور مہینہ بھر کا راشن میرے دادا بھجواتے تھے مگر پھر بھی ہر آنے والے کے آگے ممانی پورا قصہ دُہرا دیتیں..... بیوہ اور یتیم کو پالنا آسان نہیں، ہمارا ہی حوصلہ ہے ہم نے یہ ذمے داری اٹھائی ہوئی ہے۔ مجھے ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرا اسکول بھی دوسرا تھا۔ میرے کپڑے بھی معمولی سے ہوتے تھے۔ یوں سمجھیں میں پورے کا پورا یتیم تھا۔ عجیب بے بسی میرے رویے اور میرے وجود سے ظاہر ہوتی تھی۔ مجھے دوسروں کی ہمدردی زہر لگتی مگر میری شکل شاید انہیں مجھ سے ہمدردی کرنے پر مجبور کر دیتی۔ میری ماں کو سفید دوپٹے کے علاوہ کچھ اور اوڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سارا دن مصروف رہتیں بقول ممانی کے بیوہ عورتوں کو اور یتیم کی ماں کو سارا دن مصروف رہنا چاہیے وگرنہ بیکار کی سوچیں گھیریں گی۔ میں ان حالات میں سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا سمجھدار ہوا تو چھٹی کے روز دادا کے گھر جانے لگا۔ وہ گھر کے نچلے پورشن میں اکیلے رہتے تھے۔ گاؤں سے ایک آدمی اور اس کی بیوی ان کا کام کرتے تھے۔ میں اس عمر میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میں اور میری اماں یہاں دادا کے گھر کیوں نہیں رہ سکتے۔ دادا کی مدد سے میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ تایا کے گھر کوئی ایسی پابندی نہ تھی میرے سب تایا زاد مجھ سے کافی بڑے تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ میں اپنی ماں کی وجہ سے ماموں کے گھر رہنے پر مجبور تھا اور یتیم کہلوانے پر بھی..... میں نے میٹرک کر لیا۔ تایا اور تائی سعودیہ اپنے بچوں کے پاس چلے گئے اور چھ ماہ اُدھر اور کچھ عرصہ یہاں آ کر زمینوں کی دیکھ بھال کرتے۔ نیا گھر بنا کر اُدھر شفٹ ہو گئے اور اوپر کا حصہ کرایہ پر دے دیا۔ دادا نے تایا سے مشورہ کر کے اپنا یہ پرانا والا گھر میرے نام کر دیا تھا۔ تایا کے اپنے بچے بہت لائق تھے اور اچھی نوکریوں پر تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ زمینوں میں سے بھی اتنا حصہ میرے نام کر دیا جس سے اتنی آمدنی ہو جائے کہ میں پڑھائی کر سکوں اور خرچ کی تنگی نہ ہو، یہ ان کی نیکی تھی۔ ورنہ باپ کے مرنے کے بعد دادا کی وراثت میں سے مجھے کچھ بھی نہ ملتا۔ انہیں میری اماں کا بھی بھائی کے گھر نوکروں کی طرح رہنا اچھا نہیں لگتا تھا مگر کیا کرتے۔ جس دن میرے دادا کا انتقال ہوا میں اماں کو ان کے گھر میں واپس لے آیا۔ اوپر کا گھر ہم نے اپنی مرضی سے کرایے پر دے دیا۔ اماں نے زمینوں کا بھی انتظام ایسے سنبھالا جیسے وہ ہمیشہ سے یہ کام کرتی آئی ہوں۔ مزارعے خوش تھے اور ہم بھی..... اس دن آپ کے بچوں کی صورتیں دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی یتیمی کی چھاپ میں مٹا کر رہوں گا۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے، میں ان کی دیکھ بھال کر سکوں گا..... پھر میں نے آپ کی طرف دیکھا۔ آپ کے چہرے پر مجھے اپنی ماں کی بے بسی دکھائی دی جب ان کے ہاتھوں سے میری ممانی زبردستی چوڑیاں اتار رہی تھی اور کہہ رہی تھی چوڑیوں کی کھنک غیر مردوں کو متوجہ کرتی ہے تو بیوہ ہے تیرا ان پر کوئی حق نہیں۔ میں نے آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا خالی کلائیوں کو دیکھا۔ آپ کی شرمندہ جھینپی مسکراہٹ کو دیکھا اور سوچا کاش آپ کی یہ مسکراہٹ ہنسی میں بدل جائے، ہر ایک کا اپنی زندگی پر اتنا حق تو ہونا چاہیے کہ وہ کھل کر ہنس سکے یا رو سکے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر آپ نے انہیں بہنے نہیں دیا تھا۔ میری ماں کی طرح انہیں اندر اتار لیا تھا۔ ماں کے ان آنسوؤں کی جلن میں نے ہمیشہ اپنے اندر محسوس کی تھی۔ اس وقت بھی مجھے اسی تپش نے یہ قدم اٹھانے کی ہمت دی۔ میں کس رشتے سے ان بچوں کی مدد کرتا؟ انسانیت کے رشتے سے؟ رشتوں کو دنیاوی نام دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ صرف انسانیت کے ناتے جڑے رشتے بے نام رہتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ بدنام ہو جاتے ہیں سو میں نے آپ سے

www.urdupalace.com

شادی کر کے ان بچوں کا باپ کہلوانا پسند کیا۔ صورت، شکل سب ایک جیسی ہوتی ہیں، انسان اپنے فرائض کو سمجھ لے تو زندگی نبھانا مشکل نہیں ہوتی۔ زندگی صرف اپنے لیے جینے کا نام نہیں ابھی میری اماں اس رشتے پر راضی نہیں۔ آپ کو اس بات پر سمجھوتا کرنا پڑے گا مگر ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ وہ میری نیکی کو نیکی سمجھ کر قبول کرلیں گی اور خود آپ سے ملنے آئیں گی اور ایسا ہی ہوا وہ مجھے خود ملنے آئیں مگر کچھ عرصے کے بعد۔

آئندہ اتوار کو چک نمبر 434 کے چوہدری صاحب اور چند سرکردہ لوگوں کی موجودگی میں میرا نکاح شہزاد ولد میاں محمد دین ساکن پیراں غائب ملتان شہر کے ساتھ شرعی حق مہر جو شہزاد نے اپنی نو ماہ کی تنخواہ کے مطابق رکھا تھا، ہوگیا۔ شہزاد کی طرف سے اس کے تایا زاد بھائی اور دوستوں نے شرکت کی اور میری طرف سے میری بہن، بہنوئی اور خالہ زاد بہن، بھائی تھے میرے بچے اور اسکول کی ساتھی عورتیں تھیں۔ شہزاد کی نوکری ملتان میں تھی وہ بہ آسانی صبح جا کر شام میں آسکتا تھا مگر میں نے کہا کہ وہ صرف چھٹی والے دن آیا کرے۔ باقی ہفتہ پہلے کے معمول کے مطابق اپنی اماں کے ساتھ رہے۔ میرے لیے اس کا نام ہی معتبر ہے۔ میں اس کی ماں کی بد دعائیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کرسکتی جس کا دنیا میں اس کے بیٹے کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ شروع میں یہی معمول رہا مگر بعد میں جب کوئی چھٹی آتی تو اس کی ماں بہانہ بنا کر اپنے بھائی کے گھر یا زمینوں پر کام کا کہہ کر چلی جاتیں۔ میں بھی سمجھ جاتی تھی اور شہزاد بھی وجہ جانتا تھا اور میں دل ہی دل میں اس کی ماں کی شکر گزار رہتی تھی۔ گھر کا راشن شہزاد کی زمینوں سے آنے لگا۔ گھر کا خرچ میں اپنی تنخواہ اور شہزاد کے دیئے ہوئے پیسوں سے کرلیتی۔ ہماری ضروریات محدود تھیں اور میں نے انہیں بڑھنے بھی نہیں دیا تھا۔ ہمارا کہیں آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ سو، سو طرح کے اخراجات سے بچے ہوئے تھے۔ نئے کپڑے اور جوتے عید پر لیتے اور انہی میں گزارہ کرتے، اس سے زیادہ کی نہ خواہش تھی اور نہ تمنا کی تھی۔ گھر میں کھانے پینے کو کھلا ملتا تھا۔ کوئی لالچ نہ تھی میں جتنا بھی شکر ادا کرتی مجھے کم لگتا۔ رضیہ فصیح احمد نے لکھا تھا وقت کی کتنی مہربانی ہے کہ وہ گزر جاتا ہے ٹھہر نہیں جاتا۔ اچھا بھی اور برا بھی۔ بچوں کو اچھا وقت ملا تو دونوں میں ان کی شخصیت بدل گئی۔ تینوں بیٹیاں اسکول کی جماعتیں تو نہ پڑھ پائیں مگر جاہل بھی نہیں تھیں حساب، اردو میں کافی اچھی تھیں۔ میری نسبت زیادہ سمجھدار اور سلجھی ہوئی تھیں، میری طبیعت بھی وقت نے صاف کردی تھی مگر پھر بھی فطری لاابالی پن تھا۔ شہزاد کے ایک کزن کے بیٹے نے جو زمینوں پر کام کرتا تھا اور دسویں پاس تھا بڑی بیٹی کا رشتہ مانگا وہ پندرہ سال کی ہوگئی تھی آپا جی نے لڑکا دیکھا اور مجھے کہا کہ ہاں کردو۔ سادگی سے شادی کردی۔ ولیمے پر ہم سب ملتان گئے۔ لڑکے کے ماں باپ اور باقی رشتے داروں سے وہیں ملاقات ہوئی مگر شہزاد کی اماں خود نہیں آئیں حالانکہ مجھے پتا تھا کہ یہ رشتہ انہی کی بدولت ہوا ہے۔ شہزاد نے باتوں ہی باتوں میں ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب اس نے اماں سے مجھ سے شادی کرنے کی بات کرنے کا سوچا تھا تو پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ ان سے کہے گا کہ میں ان چھ بچوں کی بڑی بہن ہوں مگر پھر جھوٹ بولنا پسند نہ کیا اور سچ بات بتائی جو کافی لعن طعن کا باعث بنی مگر ماں، ماں ہوتی ہے، بچوں کی خواہش دل سے قبول کرے نہ کرے مانتے ہی بنتی ہے۔ مگر گاہے گاہے وہ بچوں کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں۔ پھر شہزاد سے وہ اس کے اپنے بچے کے بارے میں پوچھنے لگیں کہ کیا ارادہ ہے۔ شہزاد نے پہلے تو انہیں ٹالا کہ اماں پہلے ہی چھ ہیں۔ پھر اس نے مجھ سے اپنی ماں کی خواہش کا ذکر کیا مگر میں تو اس ذکر سے ہی نالاں تھی۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ خاموش ہوگیا۔ مگر کچھ عرصے بعد پھر ذکر کیا اور کہنے لگا کہ ملتان ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، بچوں کی ضرورت تو نہیں پھر بھی ان کی پیدائش خوش حال ازدواجی زندگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ شاید میری ماں وہ

www.urdupalace.com

جاننا چاہتی ہے کہ ہم خوش و خرم ہیں کہ نہیں۔ یہ تمام باتیں میری بیٹی کی شادی سے پہلے کی ہیں۔ میں اس کے کہنے پر اسپتال چلی گئی سب ٹیسٹ ٹھیک نکلے..... پھر ڈاکٹر نے مجھ سے چند سوالات کیے سرسری سے۔ کتنے بچے ہیں؟ نارمل ہیں؟ ابھی اتنا وقفہ کیسے ہوگیا۔ میں نے ہر بات سچ کہی کہ یہ بچے میرے پہلے خاوند سے ہیں چھپانے کا کیا فائدہ تھا۔ اس نے میرے سامنے شہزاد سے بات کی۔ وجہ کچھ بھی نہیں آپ کی بیوی دوبارہ ماں بننے سے ڈرتی ہے کہ آپ بھی اسے چھوڑ دیں گے۔ ماں بننا ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے مگر کبھی کبھی کوئی خرابی نہ ہونے کے باوجود وہ بانجھ ہو جاتی ہے کوئی ڈر کوئی صدمہ اس کی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ بیوی کو اپنی محبت کا اعتماد دیں۔ حوصلہ دیں، قدرت مہربان ہو سکتی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں اپنے اندر ماں بننے کی نہ خواہش رکھتی تھی اور نہ ہی بننا چاہتی تھی۔ قدرت ایک خاوند ملنے کی صورت میں مجھ پر مہربان ہوئی تھی اور میرے لیے یہی کافی تھا میں اس پر کسی قسم کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے بعد شہزاد نے اپنی اماں کو کیسے سمجھایا مگر دوبارہ بچے کا ذکر نہیں چھیڑا۔

ملتان سے واپسی پر ہم ٹرین میں تھے بیٹی کو رخصت کر کے آنے کا دکھ اپنی جگہ مگر میں مطمئن تھی، میری دوسری والی بیٹی چھوٹی بہن کی کسی بات پر زور سے قہقہہ مار کر ہنسی میں اسے ہمیشہ اس طرح منہ پھاڑ کر ہنسنے سے منع کرتی تھی وہ اپنا خاندانی قہقہہ لگاتی تھی۔ میرے پانچ بچے سنجیدہ مزاج کے تھے۔ سب سے چھوٹی بیٹی روٹی صورت تھی اور خاموش رہتی تھی۔ مگر یہ والی سب میں چلبلی تھی۔ اونچی آواز سے بات کرنا، کھل کر ہنسنا اور باقی بہن، بھائیوں کو بھی چھیڑتے رہنا اس کا مشغلہ تھا۔ آدھے گھنٹے میں وہ باقی مسافر عورتوں سے بہنا پا جوڑ چکی تھی۔ جب یہ زور سے ہنسی تو ایک عورت میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی بہن جی میں آپ کو نہیں جانتی اور آپ بھی مجھے نہیں جانتیں مگر اپنی یہ بیٹی مجھے دے دیں۔ اس کا ٹھیٹھ دہلی والوں کا سا لہجہ اور لباس مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہ اردو بولنے والوں میں سے ہے۔ میں نے اپنے لہجے کو خاص پنجابی بناتے ہوئے کہا اللہ کا نام لیں محترمہ بیٹیاں بانٹنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ منہ میں ان کے پان تھا۔ ہاتھ میں خوب صورت گوٹا لگا پنکھا۔ زور، زور سے پنکھا جھلنے لگیں حالانکہ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

''اے نوج میں کوئی تم سے ریوڑیاں مانگوں ہوں جو تم بانٹنے کی بات کرے ہو۔ میں اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی ہوں، مجھے ایسی ہنسوڑ بہو چاہیے، ہم دہلی کے مہاجر ہیں حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ لاہور جا رہے تھے اب تمہارے ساتھ اتریں گے اور بیٹی کا رشتہ لے کر جائیں گے۔ ہمارے گھر میں ہماری دو بیٹیاں ہیں، بیاہتا ہیں سسرال میں ہیں، ایک ہی بیٹا ہے ہمارے ساتھ میں۔ سب کچھ لٹا کر آئے ہیں گھر میں اتنی خاموشی رہتی ہے کہ دل گھبراتا رہتا ہے۔ ہم ذات کے سید ہیں مگر کام سنار کا کرتے ہیں، ہنر مند لوگ ہیں ہاتھ سے کماتے ہیں حرام کا کمانا حرام سمجھتے ہیں۔'' میں تو اس کی فصیح و بلیغ اردو سے حواس باختہ ہو رہی تھی۔ اس کا تعارف اس کے لہجے کے ساتھ میری عقل سے باہر تھا۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن آیا تو لپک کر کھڑکی کی طرف گئیں۔ اور اشارے سے مجھے بھی بلایا اور اپنے بیٹے کا تعارف کروانے لگیں بیٹا بیچارہ پریشان اور میں حیران .....میں سمجھی یہ مذاق کر رہی ہیں مگر اس نے بیٹے سے کچھ کہا اور جب ہم وہاڑی کے اسٹیشن پر اترنے لگے تو دیکھا وہ اپنا صندوق اور لوٹا بند ھا بستر ساتھ لے کر اتر رہی ہے۔ شہزاد بھی یہ سب دیکھ کر پریشان تھا کہ بن بلائے مہمان کہاں سے میں پکڑ لائی ہوں، ہم وہیں اسٹیشن پر ہی ایک طرف بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی مگر مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا انہیں کیا سمجھ پاتی، وہ خود ہی اس خاتون سے اور لڑکے سے باتیں کرنے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر انہیں ٹانگے میں بٹھایا اور ساتھ گھر لے آئے اس طرح اسٹیشن پر تو چھوڑ

www.urdupalace.com

کرنہیں آسکتے تھے۔ کھانا وغیرہ کھلایا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھیں ہمارا اور آپ کا ماحول کا بہت فرق ہے۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ نہ ہم دہلی میں ہیں اور نہ تم لاہور میں اب ہم پاکستان میں ہیں، ہمارا جینا اور مرنا ایک ہے۔ زبان کا کیا ہے، ساجدہ بیگم کا دل چاہے تو پنجابی بولیں سر آنکھوں پر۔ جو لفظ سمجھ نہیں پائیں گے دوبارہ مطلب پوچھ لیں گے۔ مگر ہماری بہو بن کر یہی ہمارے آنگن میں اترے گی۔ ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور زبردستی ساجدہ کا ہاتھ پکڑا اور پہنادی۔ ناچار شہزاد کو بازار جانا پڑا کچھ مٹھائی لائے، لڑکے کا نام رشید تھا اس کے لیے تحفہ لائے اور اگلے دن کی ٹرین سے انہیں لاہور کے لیے رخصت کیا۔ پندرہ دن کے بعد واپسی پر وہ پھر ہمارے گھر آئیں ساتھ رشید کے والد اور اس کی دونوں بہنوں کو بھی لائیں باقاعدہ منگنی کی اور ایک سال کے بعد رخصتی کا کہا اور کراچی واپس چلی گئیں۔

اور جناب یہ میری بیٹی سب سے زیادہ خوش وخرم رہی ایسا دبا کے ان کے لہجے میں بولنے لگی کہ مجھے اپنے پنجابی ہونے پر شک ہونے لگا۔ تیسری بیٹی چوہدری صاحب کی بیگم کے بلاوے پر اُن کے گھر میلاد پڑھنے گئی تو ان کی ایک رشتے دار آئی ہوئی تھیں۔ یہ انہیں پسند آگئی۔ قباحت یہ تھی کہ وہ اسے اپنی سوکن بنا کر لے جانا چاہتی تھیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھوں اپنی راجدھانی سونپنے کو تیار ہوتے ہیں، میری یہ بیٹی بھی شادی کے وقت بہ مشکل پندرہ سال کی تھی اپنی دادی کی طرح نیلی آنکھوں والی گوری چٹی اور اپنی عمر سے بڑی دکھنے والی۔ کچھ اچھا اوڑھ پہن لیتی تو نظر ہٹانی مشکل ہو جاتی۔ زہرہ بیگم کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے اولاد نہیں تھی۔ اس نے قسمیں کھا کر ہمیں یقین دلایا کہ وہ اسے ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح رکھیں گی اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔ بیگم صاحبہ نے بھی یقین دلایا کہ یہ زمیندار لوگ ہیں گھر کا اناج، دودھ، دہی..... تمہاری بیٹی نے بنا کر رکھی تو راج کرے گی، سب لوگ بہت اچھے اور خیال کرنے والے ہیں، جائداد کا وارث چاہیے، مجھے یہ ڈر کہ وارث مل گیا تو اسے لات مار کر گھر سے نہ نکال دیں۔ یہ بیچاری بے زبان گائے..... پڑھی نہ لکھی کیا کرے گی۔ شہزاد ہی میرا سہارا بنا اس کا ایک جملہ کہ قسمت اوپر والا لکھتا ہے بندے کا کام راضی رہنا ہے اور اپنے کو حالت کے مطابق رکھنے کا ہنر تدبیر کہلاتا ہے۔ یقیناً ہماری بیٹی سمجھداری کا ثبوت دے گی اور سب کا دل اپنی طرف مائل کرلے گی پھر کوئی اسے گھر سے نہیں نکال سکے گا۔ اس شیرنی نے چھ بیٹیاں پیدا کر کے زہرہ بیگم کی گود کیا سارا آنگن بھر دیا۔ انہوں نے بھی اللہ کی رحمتوں کا صحیح حق ادا کیا بہترین تعلیم اور تربیت دی، چھ بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تو اسی رات خاوند چل بسا۔ میں روتی پیٹتی اس کے گھر پہنچی کہ اب کیا ہوگا۔ مگر آفرین ہے سب گھر والوں پر اور خاص زہرہ بیگم اور ان کی ساس پر اتنے صبر اور ہمت سے حالات کا سامنا کیا۔ بیٹا تو مہمانوں اور رشتے داروں کی آمد اور رولے میں بچ نہ پایا۔ نیلم کی بھی حالت خراب تھی۔ بچیوں کو زہرہ بیگم سنبھال رہی تھیں۔ اس کی ساس نے کہہ دیا کہ نیلم کہیں نہیں جائے گی یہ اور بچیاں ہماری ہیں، ہم جو فیصلہ کریں گے اس کے لیے بہتر ہوگا۔ میری کیا حیثیت تھی کہ کچھ کہہ سکتی۔ ساتھ لے آتی تو اس کا کیا مستقبل ہوتا۔ بچیاں بھی بالکل چھوٹی تھیں۔ زہرہ بیگم نے یہ کیا کہ اس کی اور اپنی عدت ختم ہوتے ہی نیلم کا نکاح اپنے اور اس کے دیور سے کر دیا۔ یہ لڑکا بھی نیلم سے پانچ سال بڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سال کے بعد ہی اسے دو جڑواں بیٹے عطا کیے جو اس نے زہرہ بیگم کی گود میں ڈال دیے اور خود اپنے آپ کو گھر، زمین، ڈھور ڈنگر سنبھالنے میں مصروف کرلیا۔ بیٹیاں بڑی ہوئیں سب نے اچھی تعلیم حاصل کی اور بہنوں اور پھپھو نے اپنے، اپنے گھروں میں بیاہ لیں۔

چوتھے نمبر کا بیٹا دسویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ شہزاد اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا اس کی ماں

www.urdupalace.com

نے بہت دھیان رکھا اور اس نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کرلیا یہ مجھ پر ان کا ایک اور احسان تھا۔ ہمارا اسکول کافی ترقی کرچکا تھا۔ اتنے سالوں میں بچوں کی تعداد بڑھ چکی تھی۔ عمارت میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ مزید تین استانیاں اور آگئی تھیں۔ جنہوں نے بی ایڈ کیا ہوا تھا۔ نئی ہیڈ مسٹریس کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ چھوٹے دو بچے لڑکی اور لڑکا بھی بڑی کلاسوں میں آچکے تھے۔ ان کے لیے مڈل اسکول کی ضرورت تھی۔ ساجدہ کے سسرال والے کاروبار کی وجہ سے لاہور آکر سیٹل ہوگئے تھے۔ شہزاد نے مشورہ دیا کہ اب بڑے بیٹے کو کالج جانا ہے اور چھوٹوں نے بھی ہائی اسکول تو بہتر ہے کہ ہم لاہور چلے جائیں گھر کرایے پر لے لیں گے۔ آپ کے ساتھ کے لیے ساجدہ وہاں ہے اس کا اپنا وہی معمول تھا۔ چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارتا تھا باقی کا وقت ملتان اماں کے گھر کیونکہ اس نے ٹیوشن سینٹر بھی کھولا ہوا تھا۔ پڑھانا ضرورت سے زیادہ اپنا شوق تھا۔ سو..... ایک مدت کے بعد میں اپنے شہر لاہور آگئی۔ حالات بدل چکے تھے۔ اور ساتھ میں لوگوں کے رویے بھی پرانی سسرال سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ البتہ بڑی دونوں بیٹیاں اپنے بڑے سوتیلے بھائی اور بہن سے ملتی تھیں، میں نے کبھی نہیں روکا تھا مگر اُن میں سے ان کے گھر کبھی کوئی نہیں آتا تھا۔ نہ کسی شادی میں نہ عید تہوار پر انہوں نے کبھی بلایا۔ میری بھانجیاں جو لاہور میں تھیں اتنے عرصے بعد ملنے پر بہت خوش تھیں، بھتیجوں نے اپنے گھر بنا لیے تھے، بڑی بھابی فوت ہوگئی تھیں۔ لہٰذا ان سے دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوا۔ منجھلی والی بہت دور رہتی تھیں۔ ان سے بھی ملاقات نہ ہوسکی۔ بڑا بیٹا کالج جانا شروع ہوا۔ ایک دن دیر سے واپس آیا۔ اتفاق سے شہزاد بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے پریشان دیکھا تو پوچھنے لگا کہ کیا روز دیر سے آتا ہے میں نے کہا کہ نہیں آج خلافِ معمول ابھی تک نہیں آیا اس لیے مجھے پریشانی ہورہی ہے۔ اتنے میں وہ آگیا..... شہزاد نے اس سے پوچھا کیوں میاں دیر سے کیوں آئے ہو اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکالیں۔

''بیٹا جی چاہے نظریں نہ ملاؤ مگر بتانا تو پڑے گا۔'' شہزاد بولا، کچھ کہتے، کہتے وہ پھر رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا پھر جھجک کر بولا۔

''وہ بڑی آپا نے بلالیا تھا، وہ کالج میں مجھے لینے آئی تھیں۔''

''تو اس میں گھبرانے والی کیا بات ہے، وہ ٹھیک تو تھیں؟'' بڑی بیٹی بھی ان دنوں ملتان سے آکر لاہور رہنے لگی تھی اور اس کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

''وہ ان کے گھر ابا آئے تھے۔''

''ابا.....'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ میرے اس بیٹے کو اور اس سے چھوٹے بچوں کو باپ کی شکل بھی یاد نہ تھی یہ چار سال کا تھا جب اس نے ہم سے رابطہ ختم کیا تھا۔

''وہ بہت بیمار تھے، ہم انہیں اسپتال چھوڑنے گئے تھے۔'' وہ جلدی، جلدی بتانے لگا۔ شہزاد اسے لے کر باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو اکیلا تھا۔ کہنے لگا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وہ ان بچوں کا باپ ہے، فطرت کو جھٹلانا نہیں چاہیے قبول کرنا چاہیے وہ بہن کو وہاں اسپتال میں چھوڑ کر آیا تھا، میں نے اسے کچھ پیسے دیے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو خرچ کرلے اور جلدی واپس آجائے۔'' دو گھنٹے بعد دونوں بہن، بھائی واپس آگئے اور ساجدہ کو بھی ساتھ لے آئے، بڑی نے بتایا۔

''امی میرا دروازہ کھٹکا، گھر میں کوئی نہیں تھا سب بچے اسکول گئے تھے میں نے کھولا تو ابا کھڑے تھے بہت بیمار اور کمزور... وہ پہلے بھائی کے گھر گئے تھے، ہمیں اور آپ کو پتا ہی نہیں ایک سال پہلے بھائی دل کے دورے سے انتقال کرگئے ہیں، ابا کو پتا تھا پھر بھی وہ وہاں گئے، بھابی نے دیکھ کر بھی دروازہ نہیں کھولا، نوکر لڑکے سے کہلوا دیا کہ وہ گھر میں نہیں تو وہ میرے گھر آگئے۔''

''انہیں تمہارے گھر کا کیسے پتا چلا؟'' وہ رونے لگی۔

www.urdupalace.com

''امی وہ میرے ابا تھے، میں انہیں بھول نہیں سکتی تھی میں نے انہیں خط لکھا تھا کہ میں لاہور میں ہوں اپنا پتا بھی لکھا تھا کہ کبھی آئیں تو مجھے ملیں، یہ تین سال پہلے کی بات ہے، جب میں نئی، نئی لاہور آئی تھی۔ مگر خط کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ میں سمجھی وہ ہمیشہ کی طرح ہمیں یاد ہی نہیں کرنا چاہتے۔ آج وہ اتنے بیمار تھے کہ دروازے میں ہی بیٹھ گئے۔ میں ساتھ والوں کو چابی دے کر کہ بچے آئیں تو دروازہ کھول دیں۔ رکشا میں مشکل سے ابا کو بٹھایا، پہلے کالج گئی چپڑاسی کو بھائی کا نام پتا لکھ کر دیا اس نے بلایا تو پھر ہم اسپتال پہنچے وہاں انہیں داخل کرواتے دیر لگ گئی۔''

''ان کی چہیتی بیوی کہاں تھی ساتھ نہیں آئی اکیلا کیسے بھیج دیا۔'' میں اپنا غصہ اور رنج دبا نہیں سکی۔ میرے زخم میرے اپنے ادھیڑ رہے تھے۔

''امی جانے دیں ناں!'' ساجدہ نے کہا۔

''نہیں ٹھہرو، مجھے ساری بات امی کو بتانی ہے۔''

وہ بڑی بہت دلگرفتہ ہو رہی تھی۔ ''ابا نے بتایا کہ کچھ سال پہلے اس کا بہت برا حال ہوگیا تھا۔ ہسٹیریا مرگی میں تبدیل ہوگیا تھا اسے دورے پر دورے پڑنے شروع ہوگئے تھے۔ پہلے تو اس کی ماں سنبھالتی تھی اس کے مرنے کے بعد ابا جو اب ریٹائرڈ ہوگئے تھے اس کو سنبھالتے تھے۔ وہ کسی کام کرنے والی کو نہیں رہنے دیتی تھی۔ دورے کی حالت میں الٹیاں کرتی بستر پر گند رہتا۔ بدبو کے بھبکے آتے، ایک بار ابا گھبرا کر کراچی بھاگ گئے۔ بیوی کے بھائی انہیں ڈھونڈ کر زبردستی واپس لائے کہ جب تک وہ ٹھیک تھی تم عیش کرتے رہے اب یہ تمہاری ذمے داری ہے سنبھالو، اب گئے تو تمہیں کاٹ کر پھینک دیں گے۔ تین سال ابا نے عذاب بھگتا۔ جس دن وہ فوت ہوئی بھائیوں نے گھر سے نکال دیا۔ انہوں نے گھر کے لیے مقدمہ کرنے کا کہا تو دستاویزات نکال کر دکھا دیں کہ گھر تو نقلی کاغذوں پر بہن کے نام کیا تھا کہ اس کی شادی ہو سکے۔ کچھ عرصہ ابا کرائے کے گھر میں رہے۔ اب بیمار ہو کر یہاں آئے ہیں، اماں میں انہیں رکھ لیتی مگر ہاشم کبھی نہیں مانیں گے اس لیے سوچا اسپتال داخل کروا آؤں وہ بہت معافیاں مانگتے ہیں جو انہوں نے کیا اس کا عذاب بھگت رہے ہیں۔'' شہزاد میری طرف دیکھنے لگے۔

''یہ وہ آدمی ہے جس نے میری زندگی کی ہر خوشی چھینی، عورت ہونے کا مان، ماں بننے کی صلاحیت اور غرور..... میری ہنسی، حتیٰ کہ میرے آنسو بھی اس نے مجھے اتنا رُلایا کہ اب آنکھ میں آنسو نہیں آتے۔ آنچ آتی ہے، جلن ہوتی ہے، کنکر چبھتے ہیں، میری اپنی ذات کا اعتماد، بھروسا سب اس نے چھینا۔ میرے پاس معاف کرنے والا دل ہی نہیں رہا۔ کانچ کے ٹکڑے ہیں جو میرے سینے میں دھڑک کر مجھے زخمی کرتے ہیں۔'' میں بولتے، بولتے تھک گئی شادی کے بعد میں آج پہلی بار شہزاد کے سامنے اتنا بولی تھی۔ ورنہ وہی باتیں کرتا تھا، میں تو ہنستی تھی نہ زیادہ بولتی تھی۔ نہ ہی کبھی اپنی کسی تکلیف کا ذکر کیا تھا۔ اس نے بچوں کو اشارے سے خاموش رکھا۔

''چلیں آج آپ کی امی نے دل کی بھڑاس نکال لی۔ آئندہ سے یہ ہنسیں گی اور بولیں گی ان سے وعدہ لے لیں وقت کی ضرورت ہے۔'' شہزاد کو غم ہلکا کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس نے تینوں سے کہا کہ وہ دوسرے دن پھر باپ کو دیکھنے جائیں اور اس کی ہر ممکن مدد کریں۔ ہو سکے تو باقی رشتے داروں کو بھی اطلاع دیں۔ یہ وہ وقت تھا ابھی موبائل فون نہیں آئے تھے نہ ہی گھروں میں عام فون کی سہولت تھی۔ PCO سے جا کر فون کرنے ہوتے تھے۔ ان کی سوتیلی بہن اور کزن کے گھروں میں فون تھے اور میری بیٹیوں نے بڑے پیار سے یہ فون نمبر سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ جب اگلے دن ملاقات کے وقت یہ سب پہنچے تو اسپتال والوں نے اس کی لاش کو لاوارث کہہ کر مردہ خانہ میں رکھوا دیا تھا۔ رات کے کسی پہر درد سے کراہتے اس کی جان نکل گئی تھی۔ اس کے رشتے دار بعد میں پہنچے تھے..... میں نے اس کے لیے برا کبھی نہیں سوچا تھا مگر

www.urdupalace.com

اچھا بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

بڑے بیٹے نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ نوکری کر کے گھر کے خرچ میں ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔ اسٹور کیپر کا کام مل گیا۔ اسی دوران میری بھانجی کے بڑے بیٹے نے شارجہ میں کاروبار شروع کیا بڑا سا ویئر ہاؤس تھا اس کی دیکھ بھال کے لیے اس نے اسے باہر بلالیا۔ اپنے گھر میں رکھا اور وہ تھوڑے سے پیسے رکھ کر باقی سب ہمیں بھجوا دیتا تھا۔ ہم نے اچھا گھر کرایے پر لے لیا۔ دونوں چھوٹے میٹرک کر چکے تھے، بیٹا، بیٹی سے چھوٹا تھا مگر ایک ساتھ ایک ہی جماعت میں تھے۔ بیٹا کالج چلا گیا۔ میری بھانجی کی معرفت ایک بڑے اچھے لڑکے کا رشتہ آیا۔ بی اے پاس تھا اور میری بھانجی کے شوہر کے دفتر میں ملازم تھا۔ چھوٹی کی شادی، میری خواہش کے مطابق ہوئی۔ سو سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ جہیز میں برتن، بستر، فرنیچر سب کچھ دیا۔ کھانا میری بھانجی کی طرف سے تھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ اپنے گھر میں سب سے زیادہ سکھی رہی۔ پہلی تینوں بیٹیوں کے وقت تو گھر سے میں ایک تنکا بھی جہیز کے نام کا نہ دے سکی تھی۔

رشتے دار بھی شریک نہ ہوئے تھے۔ انہیں شربت کے ایک گلاس اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ کپڑے بھی دولھا والوں کی طرف سے جو جوڑا آیا وہی پہنا دیا تھا۔ میری خواہش تھی بڑے بیٹے کی شادی بھی ساتھ ہی ہو جاتی مگر اس نے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی، بیٹی کو رخصت کر کے گھر واپس آئے تو شہزاد نے بستر پر لیٹتے ہی لمبی سانس لی۔

''الحمد للہ آج میں نے احسن طریقے سے اپنی ذمے داری نباہ دی ہے۔''

''میرا رواں، رواں آپ کا اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے آپ کا ساتھ نہ ہوتا تو میں اکیلی کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔'' میں نے کہا اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

''اب مجھے یہ دیکھنا ہے کہ آپ میرا کتنا ساتھ دیتی ہیں''، میں کچھ تھکی ہوئی تھی کچھ اس کی نظروں نے عجیب سا احساس کرایا تھا میں نے صرف یہ کہا میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گی بھی اور ساتھ چاہوں گی بھی ہمیشہ میرے ساتھ رہیے گا۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ آدھی بات سنتے، سنتے سو چکا تھا۔ اس بار وہ ملتان سے واپس آیا تو پریشان تھا اس کی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے کہا کچھ دن اور رک جاتے اس پر کہنے لگا کہ اب ریاض آئے تو اسے شادی کا کہنا ہے' میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ گھر میں ایک دوسری عورت ہو تاکہ مجھے آپ کی تنہائی کا احساس تنگ نہ کرے اور میں اماں کے پاس آرام سے رہ سکوں۔ اس نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ اماں کے وہ بھائی اور بھابی جنہوں نے بچپن میں شہزاد اور اس کی ماں کو رکھا تھا۔ اچانک آگے پیچھے فوت ہو گئے۔ اماں افسوس کے لیے گئیں تو دیکھا کہ ان کی درمیان والی بیٹی، بھابیوں کے ہاتھوں بہت پریشان ہے بھائی باہر کے ملکوں میں کمار ہے تھے۔ مگر بہن کو بیوپوں کے رحم و کرم پر چھوڑا ہوا تھا۔ اس کا نکاح ہوا تھا مگر رخصتی نہ ہو سکی تھی۔ اماں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہیں اور اب اس کی فکر کم ہو گئی ہے۔ میں نے کشور کا پوچھا کہ وہ کہاں ہے یہ اس لڑکی کا نام تھا۔ کہنے لگا وہ تو ہے مگر میں خود دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں، بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ واپس گیا مگر جلدی لوٹ آیا..... پریشان تھا میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔

''بات اچھی نہیں ہے اور اگر میں ماں کی محبت کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا تو کبھی آپ سے کہنے کی جرأت نہ کرتا..... اماں مجھ پر شادی کا دباؤ ڈال رہی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تم ذمے داریوں کے نام پر زیب النسا سے شادی کی تھی۔ اب وہ تم پوری کر چکے ہو..... اب ماں کی خواہش پوری کر دو میں اپنے پوتے، پوتیاں دیکھنا چاہتی ہوں اگر تمہاری بیوی یہ خواہش پوری کر دیتی تو میں خاموش رہتی مگر اب وقت ہے تم میری خوشی پوری کر دو۔ میں تمہیں زیب النسا کو چھوڑنے کا کبھی نہیں کہوں گی تم اس کے پاس ویسے ہی رہو جیسا اب تک کر رہے ہو۔

www.urdupalace.com

آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟'' میں بھی ماں تھی اور شہزاد کی اماں کی احسان مند بھی..... میں کیا کہتی اتنا لمبا عرصہ وہ میری اولاد کو پالتا رہا، غمی خوشی میں برابر کا شریک رہا۔ میرے رشتے داروں سے نبھاتا رہا اور اگر اس کی اماں چاہتی اور زور دیتی تو شاید وہ مجبور ہو کر میرے ساتھ نکاح نہ کرتا۔ میں آج بھی اسی چھوٹے سے اسکول میں اسی کسمپرسی کی حالت میں رہ رہی ہوتی۔ شہزاد نے باپ بن کر بیٹیاں رخصت کیں، بیٹیوں کو پڑھایا آج وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں تو اسی کے دیے ہوئے حوصلے کی وجہ سے..... میں نے اسے روتے دل مگر ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ اماں کی خواہش پوری کرنے کی اجازت دے دی۔ اس نے خود ہی بتا دیا کہ وہ کشور کے ساتھ اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ بہو کی حیثیت سے اس گھر میں رہ سکے۔ اگلے دن وہ چلا گیا۔ اور یہ ویسی ہی ستمبر کی حبس بھری رات تھی جب ایک بار پھر میری قسمت مجھ سے روٹھ رہی تھی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جس سے میں ڈر رہی تھی۔ ریاض کی شادی ہوئی وہ خوشی خوشی انتظامات میں شامل ہوا۔ اس بار ریاض ٹی وی کے ساتھ دو موبائل بھی لے کر آیا۔ ایک میرے لیے اور ایک شہزاد کے لیے کہ ہم دور ہوتے ہوئے بھی باتیں کر سکیں۔ مجھ سے تو عام فون پر بات نہیں ہوتی تھی تو موبائل فون کیسے سیکھتی۔ وہ چھوٹے فیاض کے پاس ہی رہا وہی ملا کر دے دیتا۔ ہم نے شہزاد کی شادی کی بات بالکل بھی نہیں چھپائی۔ میری سب بیٹیوں اور رشتے داروں کو پتا تھا۔ کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ سب کو شہزاد کی اماں کی خوشی عزیز تھی۔ شہزاد کا ہمیشہ سے یہ طریقہ تھا کہ وہ ایک عید ہمارے ساتھ کرتا اور ایک ملتان اپنے گھر..... اس بار وہ بڑی عید پر گھر گیا تو تقریباً رمضان تک واپس نہ آیا۔ میرا دل ایک عورت کا دل دوسری بیوی سے بدظن دل..... میں یہی سوچتی رہی کہ جوان بیوی کے ہوتے ہوئے بھلا اب وہ میرے پاس کیوں آئے گا۔ بہت دنوں سے فون پر بھی بات نہیں ہو پائی تھی۔ رمضان شروع ہو گیا تھا۔ فیاض کے بی اے کے امتحان ہونے والے تھے اس نے اپنے دوستوں کی

نمکین غزل

عشق میں پیدا ہونے والے تفکرات ہیں ہم
واپڈا والوں کو جو لاحق ہیں وہ خطرات ہیں ہم
ہم تیری سانس کی ڈوری سے جڑے ہیں ایسے
گویا آکسیجن اور CO_2 کے ذرات ہیں ہم
تیری جدائی اب برداشت نہیں ہوتی ہے
حاکمِ وقت سے بھولے مذاکرات ہیں ہم
ہم تمہیں بھول کر بھی بھولنا نہیں چاہتے
سرد موسم میں اڑتے آبی بخارات ہیں ہم
اب یہ دل ہم سے سنبھلتا نہیں آ کر سنبھالو
پتنگ اور ڈور کے الجھے ہوئے اثرات ہیں ہم
پڑھا سکے جو محبت کی گرامر اس کو
تاریخ ڈھونڈتی ہے جس کو وہ سقراط ہیں ہم

از: نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ

☆.....☆.....☆

غزل

تمہاری دید سے سیری نہیں ہے
یونہی تو نیند بھی بیری نہیں ہے
تمہاری یاد سے محروم جاناں
کوئی بھی شب میری ٹھہری نہیں ہے
وسیع خاموشیوں میں تیری آہٹ
میری ہی سلطنت میری نہیں ہے
ہے پس منظر میں بند آنکھوں کے تو ہی
میری تو نیند بھی گہری نہیں ہے
تمہارا ساتھ چھوڑوں سوچا کیسے
وفا کرنی کوئی چھوڑی نہیں ہے
مجھے سب توڑتے ہیں لمحہ، لمحہ
مگر امید پس توڑی نہیں ہے

شاعرہ: خولہ عرفان، کراچی

www.urdupalace.com

دیکھا دیکھی امریکا کی لاٹری والی اسکیم میں فارم بھر کر بھیج دیے تھے اس کا نام نکل آیا تھا۔ اب کرائے کی رقم کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ گو ریاض نے وعدہ کیا تھا مگر وہ شہزاد کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل اندر ہی اندر ناراض رہتا۔ کسی کام میں نہ لگتا..... روزے فرض سمجھ کر رکھ رہی تھی۔ لاہور والی دونوں بیٹیاں بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں کیونکہ عید پر ریاض کے آنے کا بھی ارادہ تھا۔ ان کا خیال تھا عید اکٹھے کریں گے مگر شہزاد کا نام لینے سے گریز کر رہی تھیں کہ پتا نہیں وہ آئے گا یا نہیں..... عید سے دو دن پہلے دروازے پر رکشا رکا۔ اتفاق سے میں گھر میں اکیلی تھی۔ بہو اور بیٹیاں عید کی خریداری کے لیے بازار گئی ہوئی تھیں۔ دروازہ کھولا تو ایک مدبر سی عورت سفید چادر اوڑھے اندر آگئی اور سیدھی میرے گلے لگ کر مجھے پیار کرنے لگی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو تربوزی رنگ کے سوٹ میں ایک جوان لڑکی تو نہیں کہوں گی مگر جوان عورت بھی اندر آرہی تھی تیسرا چہرہ جو مجھے نظر آیا اس نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ شہزاد سوٹ کیس لیے اندر آرہا تھا۔

''میرا قصور نہیں، یہ اماں کی آخری خواہش تھی جو بقول ان کے آخری ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتی تھیں اور میں ٹھہرا ہمیشہ کا تابعدار بیٹا کیسے نہ مانتا۔'' میں نے دیکھا کہ کشور چلتے ہوئے تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہی ہے وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ شہزاد خود ہی بازار سے جا کر ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔ اس کی اماں کو میں نے آپا جی کہہ کر ہی مخاطب کیا مگر مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اتنا عرصے بعد انہیں مجھ سے ملنے کا خیال کیوں آیا۔ وہ خود ہی بتانا شروع ہوئیں۔

''جب شہزاد نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا تو میں روایتی ماؤں کی طرح اس بات سے ناراض تھی کہ ایک ایسی عورت جو تم سے عمر میں بڑی چھ بچوں کا ساتھ تمہارے ساتھ کیسے رہ پائے گی۔ یہ بالکل خاموش رہتا۔ جب میں تمہاری برائیاں شروع کرتی کہ ضرور وہ انتہائی چالاک اور شاطر عورت ہے جس نے کٹورا کماؤ لڑکا قابو کر لیا ہے اور یہ جواب میں کہتا کہ اماں وہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر پاتی تھی۔ جب میں زیادہ ناراض ہونے لگتی تو یہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا اماں جی آپ میری نیکی کو گناہ نہ بنائیں۔ اسے نیکی ہی رہنے دیں میں آپ کا گناہ گار ہوں اللہ کے سامنے سرخ رو رہنے دیں۔ وہ میری نیت جانتا ہے، پھر آہستہ، آہستہ جب اس کا معمول وہی رہا کہ زیادہ میرے پاس رہتا اور تھوڑے دن تمہارے پاس تو میں سمجھ گئی کہ تم کسی اچھے خاندان کی سمجھدار خاتون ہو۔ پھر تمہاری کوئی ایسی فرمائشیں بھی نہیں ہوتی تھیں جو شہزاد کو پریشان کرتیں۔ پھر میرے پاس کشور آگئی۔ اس کا رشتہ بچپن سے اپنی خالہ کے گھر ہونے والا تھا۔ نکاح ہو چکا تھا کچھ عرصہ شادی سے پہلے اسے بخار چڑھا اور اس کی ایک ٹانگ مفلوج ہو گئی۔ غالباً پولیو ہو گیا تھا۔ لڑکے نے رشتے توڑ دیا۔ ماں باپ غم سہہ نہ سکے اور یہ بیچاری بھابیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ ٹانگ اس کی مالش وغیرہ سے بہتر ہو گئی مگر لنگڑاہٹ باقی رہ گئی۔ پھر میں نے شہزاد پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ اس سے شادی کر لے اگر میں مر گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ یہ تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا ٹالتا گیا۔ جب تم نے خوشی سے اجازت دی تو یہ راضی ہوا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں، تم بھی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہاری خوشیاں نہیں چاہی تھیں مگر تم نے میری خوشی پوری کر دی۔'' ان کی بات کے جواب میں میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

''شہزاد گواہ ہے آپا جی! میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہی ہوں اور کبھی آپ سے آپ کے بیٹے کو الگ کرنے کا نہیں سوچا۔'' میرے پاس کوئی بھی زیور نہیں تھا پھر مجھے ان بندوں کا کیا خیال آیا جو مجھے شادی والے دن شہزاد نے منہ دکھائی میں دیے تھے اور میں نے شرم کے مارے کبھی نہیں پہنے تھے۔ میں اندر جا کر وہ لائی اور کشور کو سلامی کے طور پر دے دیے۔ اس نے میرے ہاتھ سے پکڑ لیے ایک منٹ کے لیے میرے

www.urdupalace.com

دل کی دھڑکن تھم گئی کہ میں نے شہزاد کے ساتھ اپنی واحد پونجی بھی اسے تھمادی ہے۔ اس نے مسکرا کر ایک بندہ پکڑا اور میرا چہرہ پکڑ کر میرے کان میں ڈال دیا اور اسی طرح دوسرا دوسرے کان میں۔

''مجھے پتا ہے ان بندوں کے بارے میں کہ یہ آپ کی رونمائی کے ہیں، میں شہزاد کی کزن بھی ہوں اور اس کے بہت سے رازوں کی شریک بھی..... مجھے اپنی سوتن کبھی نہ سمجھیے گا۔ میں آپ کی بہن ہوں۔'' وہ عید میری زندگی کی سب سے خوب صورت عید تھی۔ میرا کنبہ مکمل تھا۔ کون کہتا ہے نیکی کے فرشتے دنیا میں نہیں ہوتے۔ بس قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر اور احسان ہے میں ان خوش قسمتوں میں سے ایک ہوں۔

☆☆☆

کافی عرصے کے بعد میں اس دفعہ انگلینڈ سے واپس آئی تو چھوٹی خالہ (زیب النسا) سے ملنے کو بہت دل کیا۔ میں نے اپنی بڑی بہن سے کہا تو انہوں نے کہا کہ چند روز میں چلیں گے۔ دراصل ابھی عید کو گزرے دو دن ہوئے تھے اور وہ عید سے پہلے خالہ کو ان کی بہو، بیٹیوں، پوتوں، نواسوں کو عیدی دے کر آئی تھیں اور خیال تھا کہ عید کے بعد وہ گھر بدل رہی ہیں اس لیے جانا التوا میں پڑتا رہا، ایک صبح تقریباً تین بجے خالہ کی بیٹی کا فون آیا کہ ان کی وفات ہوگئی ہے۔ نہ ملنے کا بہت افسوس ہوا خیر ہم کوئی دس بجے کے قریب ان کے گھر پہنچ گئے جہاں ان کی میت کو کچھ دیر پہلے اسپتال سے گھر لے کر آئے تھے۔ سارا محلہ جمع تھا۔ ان کا اپنا پورا خاندان سرگودھا، سیالکوٹ، ملتان، دہاڑی سے ان کی نواسیاں، نواسے سب پہنچ چکے تھے۔ درمیان والی بیٹی کیونکہ ذرا دور گاؤں میں تھی اس کے فون پر فون آرہے تھے کہ جلدی نہ کرنا میرا انتظار کرنا ہے۔ امریکا والا بیٹا عید کر کے گیا تھا وہ نہ آسکا۔ بڑا بیٹا ان دنوں یمن چلا گیا تھا، شام تک متوقع تھا۔ ہر ملنے والا وہاں پر موجود شخص خالہ کی تعریفیں کر رہا تھا۔ خالہ تقریباً پچاسی سال کی تھیں مگر دیکھنے میں ساٹھ سے اوپر کی نہ لگتی تھیں ان کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ عصر کا وقت ہونے والا تھا بڑا بیٹا بھی پہنچ گیا تھا۔ میں نے خالہ کی بڑی بیٹی سے پوچھا کہ اب کیا دیر ہے، اس نے جواب دیا کہ چچا شہزاد کا انتظار کر رہے ہیں، خالہ کے بڑے چار بچے انہیں چچا بلاتے تھے اور چھوٹے دو ابا کہتے تھے۔ میں حیران ہوئی کیونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ دوسری شادی کر چکے ہیں وہ کیوں آئیں گے، میں نے پوچھا کچھ مجھے یہ جاننے کی بھی خواہش تھی کہ سوتیلی ماؤں کے بارے میں تو بہت کچھ سن رکھا تھا مگر سوتیلے باپ کے بارے میں بچے کیا محسوس کرتے ہیں یہ نہیں پتا تھا..... اور نہ ہی کوئی مثال سامنے تھی۔ اس نے کہا۔

''ہاں بے شک انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی مگر ہماری ماں کو اور ہمیں کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر غم، خوشی کے موقع پر ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ ہر نواسے، نواسی، پوتے، پوتی کی تاریخ پیدائش لکھ کر رکھتے تھے۔ تحفہ بھجوانا نہیں بھولتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات ہماری اماں ان کے نکاح میں ہیں وہ خود اپنے ہاتھ سے انہیں قبر میں اتاریں گے۔ اور پہلے جنازہ اٹھنے کی اجازت وہ دیں گے۔'' اس کے لہجے میں باپ کے لیے جو عزت اور پیار موجود تھا وہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ سب ان کی کتنی عزت کرتے ہیں، تھوڑی دیر میں خالو مع اپنے بچوں اور بیوی کے پہنچ گئے دیر اس لیے ہوئی کہ رکشا والا انہیں غلط سمت میں لے گیا تھا۔ ان کے ساتھ چودہ پندرہ سال کے دو لڑکے تھے باپ کے ساتھ بھاگ، بھاگ کر کام کروا رہے تھے اور دوسری والی بیوی سب بیٹیوں اور ان کے بچوں سے یوں گلے مل رہی تھی جیسے ان کی سگی ماں ہو۔ ہم سے بھی ملی خالہ کی بہت تعریف کی اور افسوس کیا۔

رشتے دراصل تو رشتے ہی ہوتے ہیں، ہمارے رویے انہیں سگا، یا سوتیلا کر دیتے ہیں، کبھی گرم، کبھی سرد، تلخ و شیریں، محبت، پیار اور اعتماد سب سے بڑے ہتھیار ہیں جو اپنوں اور غیروں کو ملائے رکھتے ہیں۔

www.urdupalace.com

Advertisement at Urdu Palace

Are you looking for an affordable website to advertise your business?
Urdu Palace offers lowest rates for all advertisers.
For Advertisement of your brand or business on our website call us or contact through

Whatsapp on following numbers:+92-348-8709449,+92-303-5110135

www.urdupalace.com